Cat by h

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو ۱۴۳

تنویر تخیل

المعی حیدرآبادی

مطبوعہ
عہد آفریں پریس معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد دکن

طبع اول

قیمت ([illegible])



وحید العصر مولانا سید نجم الدین المعی

[illegible]

از

[illegible]

اخلاق و کردار کی وجہ سے بہت ممتاز مقام رکھتے تھے۔
بہ حیثیت انسان ہم اُن کے کردار میں جو خوبیاں دیکھتے
ہیں ان کے مقابلے میں بہ حیثیت شاعر ان کی قدر و منزلت
بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ
انسان اپنے جس کمال یا وصف کو کوئی خاص اہمیت نہیں
دیتا بسا اوقات وہی اس کی شہرت کا باعث ہوتا ہے
اور اسی کے ذریعے وہ خاص و عام میں مشہور ہوتا ہے
اور اسی کے باعث اس کی زندگی اور کردار کے دوسرے
پہلوؤں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوتی ہے۔
آج ہم مولانا المعیؔ کو ان کے کلام کی وجہ سے
جانتے ہیں اور ان کی شاعری کی وجہ سے ان کے حالات
زندگی معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔
مولانا المعیؔ ایک ایسے سید گھرانے کے چشم و
چراغ تھے، جو سیادت کے علاوہ علم و فضل، زہد و تقویٰ اور
فقر و قناعت کی صفاتِ محمودہ سے متصف رہا ہے۔ ان کے

دادا مولانا سید مبارک صاحب اپنے زمانے میں حیدرآباد کے بہت مشہور قاری تھے۔ ان کے والد مولانا سید محمود صاحب ایسے پایے کے حافظ قرآن تھے کہ دن بھر میں پورے کلام اللہ کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ان دونوں بزرگواروں سے تقویٰ اور پرہیزگاری مولانا کو موروثی طور پر ملی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مقتضائے زمانہ کے تحت انگریزی تعلیم پائی اور مدرسۂ عالیہ کے انگریزی ماحول میں کئی برس رہے لیکن وہ اس سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے اور وہ قدیم وضع داری جو ان کے خاندان کی خصوصیت تھی ان میں بچپن سے لیکر آخر عمر تک برابر قایم رہی۔

مولانا نے علوم عربی اور زبان فارسی کی تحصیل بحر العلوم علامہ سید اشرف صاحب شمسی سے کی تھی اور وہ اُن کے ایسے شاگرد تھے جن پر خود علامہ کو فخر و ناز تھا۔ علوم عربی میں ان کی دستگاہ کے اظہار کے لیے علامہ مذکور کے یہ الفاظ کہ "المعی قوم میں ایک فاضل اجل ہیں" بہت کافی

ہیں۔ اگرچہ مولانا المعی نے انگریزی میں میٹرک سے زیادہ
تعلیم نہیں پائی تھی لیکن ان کی انگریزی استعداد ابتدائے
ملازمت کے وقت ہی اتنی اچھی تھی کہ ان کا تقرر مترجم
انگریزی دفتر پیشی اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی اہم خدمت
پر کیا گیا۔ اس ملازمت کے سلسلے میں نیز نواب سرامین جنگ بہادر
کی علم دوستی کے سبب نواب صاحب موصوف کے کتب خانے
سے جو حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے خانگی کتب خانوں
میں ایک بہترین کتب خانہ مانا جاتا ہے، مولانا کو استفادے
کا موقع مل گیا اور انھوں نے رفتہ رفتہ مسلسل مطالعے کی
بدولت انگریزی زبان اور جدید تاریخ و فلسفہ میں بھی بڑی
مہارت پیدا کرلی۔ اگرچہ مولانا بہ ظاہر ایک معمولی اور متوسط
درجے کے لکھے پڑھے آدمی نظر آتے تھے لیکن جن لوگوں نے
مختلف علمی مسائل میں ان کے خیالات سنے ہیں اور جو علمی
مباحث میں ان سے گفتگو کرتے تھے ان کو معلوم ہوتا تھا کہ
مولانا مشرق کے علاوہ مغربی مورخین و فلاسفہ کے خیالات سے

کما حقہ واقف ہیں۔

مولانا دفتر پیشی اعلیٰ حضرت بندگان عالی میں منتظمی کی خدمت پر مامور تھے اور ملازمت کی اس خاص نوعیت کی وجہ سے بہت سے امرا اور عہدہ دار اُن سے ملنے، انھیں اپنے ہاں مدعو کرنے یا کسی اور طریقے پر تحفہ تحایف بھیج کر اپنی کوئی غرض ان سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر مولانا نے مدت العمر ایسی مساعی کو کامیاب ہونے نہ دیا اور ایسی معتدل روش اختیار کی کہ نہ انھیں لوگ مغرور و متکبر سمجھیں اور نہ وہ کسی دعوت یا تحفے وغیرہ کو قبول کر کے ان کے شرمندۂ احسان رہیں۔ انھوں نے جس کردار کے ساتھ ملازمت کی، اس کی قدر ان اصحاب کے دل سے پوچھنی چاہیئے جن کو ان سے سابقہ رہا ہے۔

مولانا فضایل علم و اخلاق کے علاوہ ریاضت و تقوے کے جس اعلیٰ مقام پر فایز تھے اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں وہ نہ صرف ہر وقت باوضو رہتے تھے بلکہ ان کی زبان ہر وقت

ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتی تھی۔ کثرتِ ذکر و شغل اور تقویٰ و طہارت کے سبب ان کے قلب میں ایسی صفائی پیدا ہوگئی تھی کہ انھیں خواب کی تعبیر دینے میں یدِطولیٰ حاصل تھا خود علامہ شمسی سے جب خاص خاص لوگ اپنے خواب بیان کر کے تعبیر چاہتے تو آپ انھیں مولانا المعی کے پاس بھیج دیتے اور جب وہ علامہ سے کہتے کہ بھلا میں آپ کے ہوتے کیا تعبیر دے سکتا ہوں تو علامہ فرماتے کہ تمھارا تقویٰ اسقدر زیادہ ہے کہ تم اس کام کے لیے بہت زیادہ موزوں ہو

مولانا نے عمر بھر اپنے کو طالب علم سمجھا اور مرتے دم تک طلبِ علم میں منہمک رہے۔ اپنی محدود آمدنی کے باوجود انھوں نے اپنے مذاق کے مطابق عمدہ اور چیدہ کتابوں کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا۔ وہ کتابوں کو بہت احتیاط سے رکھتے تھے۔ ان کی جلد بندی کرا کر ہر کتاب پر اپنا یہ شعر لکھ دیتے تھے ؎

دریغ پڑھنے سے اے المعی کتاب نہ کر ہزار بار اسے پڑھ مگر خراب نہ کر

مولانا کی شاعری محض ان کی طبیعت کی جولانی کا
نتیجہ ہے ۔ وہ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے ۔ عنفوان
شباب سے ان کو محض طبیعت کی اپج سے شعر کہنے کا شوق
تھا اور اسی شوق کی تکمیل میں وہ برابر شعر کہتے اور سوائے
اپنے مخصوص احباب کے کسی کو اپنا کلام نہیں سناتے ۔
رفتہ رفتہ ان کی شاعری کی شہرت احباب سے گزر کر
حیدرآباد کے شاعرانہ حلقوں میں پہنچی اور ہر طرف سے
انھیں محفل مشاعرہ میں آنے اور شعر سنانے کی دعوتیں
وصول ہونے لگیں ۔ مولانا اپنے اشعار کو بہت زیادہ
احتیاط سے محفوظ نہیں رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا
بہت سا کلام ضائع ہوگیا ۔ اس وقت جو کچھ کلام رہ گیا
ہے وہ ان کے بعض شاگردوں کی وجہ سے محفوظ رہا ۔
اور ان کے فرزند مولوی سید محمود صاحب کی کوشش سے
منظر عام پر آرہا ہے ۔ اگرچہ مولانا کسی کے شاگرد نہیں تھے
لیکن ان کی شاعری کی مقبولیت کی وجہ سے بہت سے

شاعروں نے ان کے آگے زانوے شاگردی طے کیا اور ان سے اصلاح لی۔ چنانچہ ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں بہت سے صاحب دیوان اور کافی شہرت رکھنے والے شاعر ہیں۔ مثلاً مولوی سید ابراہیم صاحب قمرؔ مولوی سید علی صاحب منظورؔ۔ مولوی سید سلام اللہ صاحب سلامؔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم خلقؔ۔ مولوی سید احمد صاحب مدہوشؔ مولوی سید سردار علی صاحب سردارؔ۔ مولوی دولت خان صاحب ثمرؔ مولوی سید ابراہیم صاحب حلیمؔ۔ مولوی سید یعقوب صاحب مرحوم نثارؔ مولوی سید اسد اللہ صاحب عباسؔ۔ مولوی سید اللہ بخش صاحب قناعتؔ مولوی سید نجم الدین صاحب نجمؔ۔ مولوی سید ابراہیم صاحب خیالؔ مولوی سید اشرف صاحب صابرؔ وغیرہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

(از)

مولوی سید محمود صاحب مددگار ناظم کوتوالی اضلاع سرکار عالی

شاعری کسی قوم یا کسی ملک کی ملکیت نہیں اور نہ کبھی کسی دور سے مختص رہی ہے۔ ہر زمانہ اور دنیا کے ہر گوشے میں شاعر پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ شاعری اصل میں قدرت کا ایک ایسا فیضان ہے کہ جس سے ہر حساس طبیعت بقدر صلاحیت واستعداد اکتساب عمل کرتی ہے۔ لیکن ہر شاعر باکمال نہیں ہوتا بہت کم نفوس دنیائے شاعری میں ایسے ہوتے ہیں جن کا کلام جدت فکر اور بلندی تخیل کے جوہر کے ساتھ سلاست وروانی کی معجز بیانی کو لیے ہوئے حد کمال کو پہنچتا ہو۔ جس طرح انسانی طبیعتوں میں عظیم اختلافات موجود ہیں اسی مناسبت سے شاعری مختلف موضوعات سخن میں

منقسم ہے۔ چنانچہ کسی شاعر کو مضمون آفرینی سے شغف ہے تو کوئی اسلوب بیان میں حسن و شگفتگی کا دلدادہ ہے۔ کسی کو مناظرِ قدرت سے دلبستگی ہے تو کوئی مظاہر فطرت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کسی کے ہاں زبان اور محاورے کے چٹخارے ہیں تو کوئی پرواز تخیل کو معیارِ سخن قرار دیتا ہے۔ کہیں سوز و گداز، حسرت و ناکامی اور یاس و حرمان کے جذبات ہیں تو کہیں حیات فانی اور بے ثباتی دنیا کے تاثرات۔ کہیں حقائق و عرفان کے دریا موجزن ہیں تو کوئی حسن و عشق کی وادیوں میں گم ہے۔ کہیں خاکساری اور فروتنی ہے تو کہیں فخر و مباہات۔ غرض ان مختلف موضوعات کلام، اصنافِ سخن اور اسلوب بیان کی بے شمار پیچیدہ راہوں کے مدنظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کونسی حقیقی شاعری ہے کہ جس کو معیارِ کمال قرار دیا جاسکے۔ شاعری سے متعلق ابتک بیسیوں مضامین لکھے جا چکے اور لکھے جارہے ہیں لیکن شاعری کا کوئی ایسا معیار قرار نہ پاسکا جس سے کسی شاعر کے کلام کو جانچا جاسکے۔ چنانچہ شاعری کے متعلق صاحبانِ علم و فن اور ماہران شعر و سخن کی مختلف رائیں ہیں۔ مِل جو انگلستان کا مشہور فلسفی کہتا ہے کہ جو چیز انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے وہ شاعری ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ شاعری جذبات اور احساسات کی مصوری کو کہتے ہیں۔ گولڈ اسمتھ کی رائے ہے جو شخص مظاہر قدرت سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور اپنے ان

تاثرات کو بعینہٖ الفاظ میں ادا کر سکتا ہے وہ شاعر ہے۔ ملٹن نے شعر کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ سادہ رواں اور حقیقت پر مبنی ہو اور اس میں ایسا جوش بھرا ہوا ہو کہ سننے والا مشتاق ہو سکے۔ کارلائل کا قول ہے کہ شاعری حقیقی جذبے کی وہ تصویر ہے کہ جو زورِ تخیل سے کھینچی جاتی ہے اور وہ جب ہمارے سامنے آتی ہے تو اصل واقعہ کی ہو بہو کیفیت ہماری نظروں میں پھر جاتی ہے۔ ایک عربی شاعر زہیر ابن ابی سلمیٰ کا خیال ہے کہ شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگوں کے دل اس کی صداقت کی داد دیں۔ ابن رشیق نے شعر کی یہ تعریف کی ہے اور خوب تعریف کی ہے کہ جب شعر سنایا جائے تو سننے والے شخص کا یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا ہی کہہ سکتا ہوں، لیکن وہ جب کہنے کا ارادہ کرے تو عاجز ہو جائے۔ محققین کی ان آرا کو دیکھنے کے بعد اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں تو غلط نہ ہوگا کہ جذباتِ انسانی کی زورِ فکر اور حسنِ تخیل کے ساتھ ایسے سادہ اور سلیس اندازِ بیان میں صحیح ترجمانی کرنے کا نام شاعری ہے کہ جس کے سننے سے سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو۔ پس اگر آپ اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر زیرِ مطالعہ کلام کو ملاحظہ فرمائیں تو واضح ہو جائیگا کہ اربابِ نظر کے لیے اس میں کس قدر سرمایۂ ذوق و کیف موجود ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس شاعر کے مختصر سوانح حیات بھی آپ کے سامنے پیش کر دیے جائیں

کیونکہ اس کے کردار سے اس کے افکار کو بڑی مناسبت ہے اگرچہ یہ کوئی ضروری امر نہیں ہے کہ کسی شاعر کا حسن تخیل اور انداز بیان جسقدر ارفع و اعلیٰ رہا ہو اسی مناسبت سے اس کے عزائم زندگی اس کے افعال اور اعمال اور اس کے اطوار و کردار بھی بلند رہے ہوں اور شاید بہت کم ایسے باکمال شاعر گزرے ہوں جن کے افکار و کردار اور قول و فعل میں یکسانیت ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ایسے شعرا بھی گنائے جاسکتے ہیں کہ جن کے کلام کو اگر اُنکی زندگی کے کارناموں سے جانچا جائے تو بلا تکلف کہا جاسکیگا کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کا عکس اور ان کی رفتار، گفتار اور کردار کے عین مطابق تھی۔ چنانچہ وحید العصر مولانا المعی مرحوم بھی جن کا نمونہ کلام آپ کے پیش نظر ہے ان معدودے چند شعرا میں تھے، جنکی شاعری اُن کی زندگی کی آئینہ دار تھی۔ اس میرے بیان کی تصدیق اُن کے چند حالات زندگی کے ملاحظے سے ہو جائیگی۔

نام و نسب اور حالات زندگی

اس شاعر قادر الکلام کا نام نامی و اسم گرامی سید نجم الدین اور تخلص المعی تھا۔ وطن حیدرآباد، محلہ کالاڈیرہ (چنچل گوڑہ) میں آپ کی پیدایش ۱۱ رجب المرجب ۱۳۰۰ھ بروز دوشنبہ ہوئی۔ آپ قوم مہدویہ کے اس خانوادۂ فقر و توکل اور رشد و ہدایت کے چشم و چراغ تھے جس کا سلسلۂ نسب (۲۹) واسطوں سے سیدنا

امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد حضرت مولانا سید محمود صاحب حال و قال اور حافظ قرآن تھے۔ ایام طفولیت سے آپ اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایۂ فضل و تقدس راسخ الاعتقاد اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ تقوے اور پرہیزگاری کی صفت جو ورثہ میں ملی تھی تا دم زیست آپ کے ساتھ رہی۔ انگریزی تعلیم آپ نے نظام کالج میں حاصل کی تھی اور امتحان میٹریکیولیشن کی کامیابی کے بعد، بعض ناگزیر اسباب کی وجہ اس سلسلہ کو منقطع کرنا پڑا۔ عربی اور فارسی علوم کی تحصیل علامہ بحرالعلوم حضرت سید اشرف شمسیؔ نوراللہ مرقدہٗ کی درسگاہ بصیرت افروز میں کی۔ استاد نے شاگرد کو وہ سب کچھ دیدیا جو اس کے بس میں تھا۔ المعیؔ کے تبحر علمی کے بارے میں خود علامہ شمسیؔ نے ایک موقع پر ارقام فرمایا تھا کہ "خدا کے فضل و کرم سے المعیؔ سلمہٗ نے علوم متداولہ کی تحصیل کی ہے۔ چنانچہ صرف و نحو، علم المعانی، علم بیان، منطق و فلسفہ، تفسیر و حدیث، کلام و فقہ، عروض و قافیہ اور تاریخ وغیرہ کو بڑی تحقیق اور محنت سے پڑھا ہے اور وہ قوم میں ایک فاضل اجل ہیں"۔ غرض اس طرح المعیؔ نے اپنے مایۂ ناز استاد کے فیضان علم و فن سے علوم دینی، عقلی و نقلی میں پایۂ بلند حاصل کیا تھا۔ چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں:-

المعیؔ حضرت شمسیؔ نے بنایا تم کو ۔۔۔ کان میں ہے سواسی اک ہمہ دان کی آمد آمد

المعی کو قدرت نے علم و فضل کے علاوہ حسن اخلاق کی دولت سے
بھی مالا مال کیا تھا۔ آداب مجلس اور حفظ مراتب کا خیال ہر وقت
ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ زبان شیریں تھی انداز بیاں دل کش تھا۔
فطرتاً منکسر المزاج، حلیم، متین اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے کسی نے
کبھی ان کو بآواز بلند بات کرتے یا غصہ میں آپے سے باہر ہوتے
نہیں دیکھا۔ مخاطبت اتنی نرم اور دلپذیر ہوتی تھی کہ دشمن بھی
گرویدہ ہو جاتے تھے۔ گفتگو نہایت سلجھی ہوئی ہوتی تھی جب کسی روایت
یا واقعہ کو بیان کرتے تو انداز بیان اتنا بلیغ اور جاذب توجہ ہوتا کہ
سننے والے کے دل میں تمنا رہتی کہ یہ اور کہے چلے جائیں۔ المعی
نے اپنی معلومات اور اپنے علم سے دوسروں کو فایدہ
پہنچانے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ہر وقت دو چار شاگرد گھیرے رہتے
اور سبھوں کو مستفید فرماتے رہے اور تعلیم و تدریس کا یہ سلسلہ
تا دم آخر یں جاری رہا۔ خلوت گزینی سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا
مجلس آرائی سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے۔ بڑے ہی پابند وضع
تھے باتوں میں کیف و لذت، ملاقاتوں میں صدق و خلوص اور گفتگو
سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ حق بات
کہنے میں نہایت بے باک تھے حق کے اظہار میں کبھی مصلحت بینی
قایل نہیں ہوئی۔ ان کی پاکیزہ سیرت اور ستودہ خصایل کا اپنے
اور بیگانوں میں چرچا رہا کرتا تھا۔ درحقیقت ان کی زندگی دوسروں

کے لیے ایک نمونہ تھی۔ یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ
تمام دن اور رات کے جس حصہ تک بیدار رہتے ہمیشہ باوضو رہا
کرتے تھے۔ خواب کی تعبیر بیان کرنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل
تھا اور اکثر و بیشتر ان کی بیان کردہ تعبیر صحیح ہوا کرتی تھی اور یہ
صفت خود انکی پاکیزگی قلب کو ظاہر کرتی تھی۔ پدر بزرگوار کا سایہ
سر سے اٹھ جانے کے بعد آپ کو اسباب معیشت کی تلاش ہوئی۔
دور جانے یا زیادہ تگ و دو کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس زمانے
میں نواب سر امین جنگ بہادر (مولوی احمد حسین صاحب) جو اسوقت
معتمد پیشی خداوندی تھے تلک بیٹھہ میں سکونت پذیر تھے۔ ہم محلہ
ہونے کی حیثیت سے المعی کی آمد و رفت مولوی صاحب کے یہاں
ایک عرصے سے جاری تھی۔ چنانچہ المعی متلاشی ملازمت ہوئے تو
نواب سر امین جنگ بہادر نے جو المعی کی ذاتی قابلیت، فطری
ذہانت اور طبیعت کی صلاحیتوں سے واقف ہو چکے تھے۔ دفتر
پیشی خداوندی میں مترجم کی خدمت پر تقرر کر دیا۔ اسطرح آپ سلک
ملازمت میں داخل ہوئے اور دفتر پیشی سے آپ کا تعلق ۱۵ مہر
۱۳۱۴ ف سے اسوقت تک رہا جبکہ رحلت سے پہلے آپ نے
آئینِ عہدویہ کے تحت دنیا ترک کر دی تھی۔ دوران ملازمت میں
بھی آپ کا علمی شغف برابر جاری تھا۔ چنانچہ دفتر کی آمد و رفت
کے وقت بھی آپ کے زیرِ مطالعہ کوئی نہ کوئی کتاب رہتی۔ ملازمت

کو آپ نے انتہائی فرض شناسی اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیا۔ چنانچہ ایک سے زیادہ موقعوں پر نواب سر امین جنگ بہادر نے آپ کی حسن کارگزاری کا اعتراف فرمایا ہے۔ کاروبار سرکاری کے مد نظر احتیاط کا یہ عالم تھا کہ دفتر پیشی خداوندی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے آپ نے کبھی کسی عہدہ دار سرکاری یا امیر اور جاگیردار وغیرہ کی دعوت میں شرکت نہیں کی اور یہ اس خیال سے کہ اگر کوئی کچھ پوچھے تو جواب دینا پڑیگا سچ کے اظہار میں افشائے راز کا ڈر تھا اور جھوٹ کہنا آپ کی فطرت کے خلاف تھا اس لیے ہمیشہ ایسی دعوتوں اور محفلوں کی شرکت سے گریز کیا کرتے تھے۔ نواب سر امین جنگ بہادر کا کتب خانہ ترتیب و تنظیم میں شاید دور حاضر کے کتب خانوں میں ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے اسمیں بہت کچھ المعی کے شغف اور دلچسپی کو دخل تھا۔ ملازمت میں آپ نے مترجم کی خدمت سے منتظمی دفتر پیشی خداوندی کی خدمت تک ترقی کی اور آخری زمانہ ملازمت میں کم و بیش (۳۰۰) روپیے تنخواہ ماہوار ملتی تھی لیکن افتاد طبیعت ایسی تھی کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپکی زندگی بالکل متوکلانہ بسر ہو رہی ہے۔ کوئی شان تھی نہ شوکت، نشست گاہ میں کوئی اہتمام تھا نہ نمائش، بے تکلف دیوانخانے میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے رہتے فارغ البالی سے کبھی آپ نے زندگی بسر

نہیں کی۔ جو کچھ کماتے تھے اس کا بڑا حصہ عزیز و اقارب سے سلوک میں۔ غریب اور محتاجوں کی مدد میں۔ اور نئی نئی کتابوں کے خریدنے میں صرف کر دیا کرتے تھے۔ کم و بیش بارہ بجے رات تک دیوانخانے میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور اس کے بعد شاید گھنٹہ دو گھنٹے سوتے تھے اور پھر تہجد کی نماز کے لیے بیدار ہو جاتے۔ سوتے ہیں سرہانے تکیہ نہیں ہوتا تھا۔ پلنگ پر نہیں سوتے تھے کمرے کے ایک حصے میں معمولی سی شطرنجی اور اس پر صاف ستھری چادر، یہی ان کا بستر تھا۔ ان کے بے تکلف احباب جب ان سے پوچھتے کہ کیوں آپ خواہ مخواہ اتنی تکلیف برداشت کرتے ہیں جبکہ خدا نے آپ کو آپ کی آسایش کے لیے کافی دے رکھا ہے تو فرماتے کہ عادت جیسی چاہے ڈالی جا سکتی ہے۔ نرم و گرم بستر پر ہر وقت نیند کا غلبہ رہتا ہے۔ اور بروقت جاگنا دشوار ہو جاتا ہے غفلت سے بچنے کے لیے مَیں نے اپنی یہ عادت بنالی ہے۔ المختصر خورونوش میں بھی بہت محتاط تھے بہت کم کھاتے تھے۔ البتہ چائے کے ایک زمانے تک بڑے عادی تھے لیکن قلب کی تکلیف کے دورے پڑنے پر چائے نوشی کو یک لخت بند کر دیا تھا۔

حلیے کے بارے میں بھی چند سطور ضروری ہیں کیونکہ علم النفس کے تحت حلیے سے بھی کردار کا پتہ چلتا ہے آپ متوسط القامت تھے نحیف الجثہ، کھلا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، بلند بینی، سیاہ اور

چمکیلی آنکھیں - نظر میں جاذبیت - چہرہ متبسم - چلنے میں سیدھی طرف کسی قدر جھک کر چلتے - آہستہ چلتے اور چلتے وقت دائیں بائیں نہیں دیکھا کرتے تھے - غالباً بینائی میں کچھ کمزوری تھی - آنکھوں پر ہر وقت عینک لگی رہتی تھی - لباس صاف ستھرا، سادہ اور ایک ہی وضع کا ہوا کرتا تھا -

شاعری

تحصیل علم کے بعد المعی کی شاعری کا زمانہ آتا ہے - ان کے ابتدائی کلام کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انکو بچپن ہی سے شعر و سخن کے ساتھ دلچسپی تھی لیکن غالباً تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے شاعری کی طرف عملی توجہ کی - طبیعت میں چونکہ استقامت تھی اور جس شعبۂ علم و فن کی طرف متوجہ ہوتے اسے حاصل کئے بغیر نہ رہتے تھے - شاعری شروع کی تو انتہائی ذوق و شغف کے ساتھ اور اس سے انہوں نے شاعری میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کرلیا تھا - اپنی اس افتاد طبیعت کو ایک شعر میں اس طرح بیان فرماتے ہیں -

جوشِ بے تابی میں جس رخ پڑ گئے ہم بہہ گئے
لہر جب آئی طبیعت میں بہا کر لے گئی

یہ ایک عجیب بات ہے کہ المعی کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں رہا اور چونکہ کسی سے تلمذ حاصل نہیں تھا اس لیے ان کا کلام بالکل فطری انکی ذاتی محنت و کاوش - تلاش و جستجو اور غور و فکر کا نتیجہ ہے -

بیشتر حصہ ان کے کلام کا ان کے تاثراتِ قلبی کا آئینہ ہے۔ بھر بندش کی چستی۔ اسلوب بیان میں سادگی۔ زبان کی شگفتگی اور پاکیزگی اظہارِ خیال کا جوش و اثر۔ اور روانی و بیساختگی کی خوبیوں نے ان کے کلام کو بہت بلند و بالا کردیا۔ جس شاعر کو دلکش انداز میں جذبات و کیفیات کے بیان کرنے کی قدرت حاصل ہو، وہ شاعر یقیناً تلامیذالرحمٰن کی تعریف میں داخل ہوتا ہے۔ المتیٰ کی فطرت خود انکی استاد۔ اور ذوق سلیم ان کا رہبر تھا۔ اُن کے ہم عصروں میں انکی خوش بیانی اور قادرالکلامی کے بڑے چرچے تھے۔ وہ ایک مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے اور اس دور کے بیسیوں شعرا کو ان سے تلمذ حاصل تھا۔ المتیٰ نے اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ اس قدر انہماک اور نظر غائر سے کیا تھا کہ جب کبھی خود ان کے یا کسی کے کسی شعر پر کوئی بحث چھڑ جاتی تو وہ کئی استادانِ فن کے اشعار سند اور ثبوت میں پیش کیا کرتے تھے۔ زبان کی صحت و صفائی اور اردو کے دلچسپ و پسندیدہ محاورات کا استعمال انکی شاعری کی خصوصیات تھیں۔ ان کے اسلوب بیان میں روزمرہ کی بول چال کو بڑا دخل تھا۔ انکے پڑھنے کا بھی ایک خاص انداز تھا۔ لوگ انکی زبان سے غزل سنتے اور سر دھنتے تھے۔ کلام میں تشبیہ و استعارات سے انھوں نے بہت کام لیا ہے لیکن اس صفائی اور اعتدال کے ساتھ کہ کہیں کلام میں پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے تشبیہات اور استعاروں نے

برمحل و برموقع استعمال سے رنگینی اور دل آویزی میں اضافہ ہوگیا۔ مولانا المعی کو ہر صنف شاعری پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ انھوں نے غزل، رباعی، قصیدہ، مسدس، ترکیب بند، خمسہ، مثلث، نعت مرثیہ اور اخلاقی نظموں میں کافی طبع آزمائی کی۔ اُن کے کلام کو بہ نظر تعمق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی شاعری پر زیادہ تر آسیر کا رنگ غالب تھا۔ چنانچہ وہ خود ارشاد فرماتے تھے۔

اے المعی ہے فیض اسیر اپنی روانی دیکھی ہے رواں آب مصفا کی نہر بھی

شاعری سے شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ المعی نے ماہ صفر ۱۳۳۹ھ میں ایک پندرہ روزہ مشاعرہ "مجلس الکلام" کی بنا ڈالی۔ جس میں حیدر آباد کے مشہور و معروف شعرا حصہ لیا کرتے تھے۔ شاعری کی ہنگامہ خیزی اور شعر و سخن کے چرچوں سے ہر پندرھویں رات کو اس مجلس میں ارباب کمال کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اس مشاعرے کے نظم و ضبط کو دیکھکر لوگ حیران رہ جاتے اور کہتے کہ اس کی مثال کسی مشاعرے میں نہیں ملتی۔

مجلس الکلام کی تنظیم اور باقاعدگی میں قدوۃ السالکین حضرت مولانا سید عیسیٰ صاحب سجادہ نشین دائرہ چنچل گوڑہ کی مساعی بھی شامل رہی ہیں۔ آپ کے دائرہ کی مسجد کے ایک حجرہ میں یہ مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس پندرہ روزہ مشاعرہ کو کامیاب بنانے والے اساتذہ و شعرا میں قابل ذکر حضرات خود المعی۔ اور حضرت نور۔ تنویر۔ توقیر۔ توحید۔ ہوش۔ ضامن کنتوری۔ منظور۔ قمر۔ عیش۔ باغ۔ نیسان

استاد۔ راسخ۔ ابر۔ طور۔ واصل۔ ذہین۔ برتر۔ عزیز۔ نجم۔ سلام۔ خلق۔ مدہوش۔ صابر اور شاعر امی حضرت صبر وغیرہ تھے اور راقم الحروف بھی اس مشاعرے کی اکثر مجلسوں میں شریک رہا ہے اور استاد فن حضرت توفیق بھی کبھی کبھی اپنے کلام معجز بیان سے محفل کو مسحور فرمایا کرتے تھے ونیز علامہ شمسی کی پرنور شرکت سے مشاعرہ جگمگا اٹھتا تھا۔ اس مشاعرہ کے فیض واثر سے شعر وسخن کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ غرض یہ مشاعرہ اپنی یادگار دلچسپیوں کے ساتھ کم وبیش ۱۰ سال تک بالالتزام بپابندی وقت منعقد ہوتا رہا۔

المعی نے اپنے کلام کو کبھی ترتیب دینے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ اپنے کلام کو باقاعدہ طور پر جمع کرتے تو یقیناً وہ کئی جلدوں پر مشتمل ہوتا۔ لیکن طبیعت کے استغنا سے وہ مجبور تھے۔ اِدھر غزل پڑھی اُدھر وہ کسی شاگرد کے ہاتھ لگ گئی اور اس وجہ سے ان کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ جو نمونۂ کلام آپ کے پیش نظر ہے وہ ان کے ایک شاگرد رشید سید نجم الدین نجم کے حسن عقیدت کا نتیجہ ہے۔ نجم نے اپنی پسندیدہ چند غزلیات، رباعیات اور نظموں کو جمع کرکے ترتیب دیا ہے ورنہ مشاعرہ کی کہی ہوئی غزلیات کا خود اتنا ذخیرہ تھا، کہ اگر ان کو منتخب کرکے مدون کیا جاتا تو ایک ضخیم دیوان تیار ہوسکتا تھا۔ مشتے نمونہ کے طور پر آپ کے ملاحظہ میں چند غزلیں کچھ رباعیات اور اخلاقی نظموں کا مجموعہ پیش کیا جارہا ہے اور اس پیشکش کا اہتمام حضرت

المعی کے فرزند جناب سید محمود صاحب سعید نے کیا ہے ۔ ان کی یہ سعی یقیناً قابل ستائش ہے ۔ ورنہ ایک باکمال شخصیت پردہ خفا ہی میں رہ جاتی ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ المعی باوجود ایک مستند اور بلند معیار شاعر ہونے کے کیوں شہرت عام حاصل نہ کرسکے ۔ اولاً یہ امر غور طلب ہے کہ کیا شہرت فی الحقیقت کمال کا ثبوت ہے میں سمجھتا ہوں کہ نہ شہرت کمال کا ثبوت ہے اور نہ گمنامی نقص کی دلیل چنانچہ بیسیوں مثالیں آپ کو ایسی ملینگی کہ بڑے بڑے باکمال لوگ نامساعدت زمانہ کی وجہ سے اپنی حیات میں شہرت نہ پاسکے ۔ زمانے نے انکی قدر نہیں کی اور انکی زندگی عالم گمنامی میں ختم ہوگئی ۔ کمال بہر حال کمال ہے خواہ شہرت عام حاصل کرسکے یا نہ کرسکے ۔ شہرت کے لیے ذرائع ، ماحول ، اسباب اور تدابیر کی ضرورت ہے اور اس موجودہ زمانہ میں پروپگنڈے کے بغیر شہرت حاصل نہیں ہوسکتی ۔ آج اسی پروپگنڈے کے ہتھیار سے کام لیکر وہ لوگ بھی شہرت حاصل کررہے ہیں جن کا معیار ادب کچھ بھی نہیں ہے ۔ اصل میں جو لوگ عزلت پسند خود دار اور نام و نمود سے بے نیاز ہوتے ہیں ان کے پاس ایسے اسباب ہی مہیا نہیں ہوتے کہ جن سے اُن کے کارنامے منظر عام پر آسکیں ۔ المعی بھی منجملہ ان شعرا کے ہیں جن کو منظر عام پر آنیکی کبھی خواہش نہیں ہوئی ۔ شاید ہی انھوں نے اپنی زندگی میں کسی مجلس الکلام

کے علاوہ کبھی کسی عام مشاعرہ میں شرکت کی ہو۔ وہ بالطبع خوددار خاموش، متین اور خلوت نشین بزرگ تھے۔ زمانہ سازی سے کوسوں دور، اور نام و نمود سے بیزار۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ ان کو انگریزی زبان پر کافی عبور حاصل تھا مطالعہ وسیع اور معلومات بسیط تھیں۔ چنانچہ دفتر پیشی مبارک کے مترجم کی خدمت پر ان کا تقرر ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ انگریزی سے خوب واقف تھے۔ لیکن کبھی کسی نے ان کو انگریزی بولتے نہیں سنا۔ حتیٰ کہ رات اور دن کے ملنے والوں میں بھی بہت کم لوگ واقف تھے کہ وہ انگریزی داں بھی ہیں۔ المعیّ کی ادبی سرگرمی اُن کی ذات ان کے حلقہ احباب اور شاگردوں تک محدود رہ گئی۔ ابنائے وطن کی بے حسی اور زمانہ کی ناقدری سے اُن کے جوہر کو ابھرنے کے مواقع حاصل نہیں ہوئے اور اس بلند معیار شاعر کا کلام ان کی اپنی زندگی میں منظر عام پر نہ آسکا۔ چنانچہ اس خصوص میں ان کا یہ اشارہ کس قدر لطیف ہے فرماتے ہیں۔

دنیائے سرد مہر نے دل کر دیا ہے پست
گرمی ہے المعیّ کے سخن میں تو کیا ہوا

المعیّ نے کم و بیش ۵۰ سال کی حیات پائی تھی اور اس میں بھی اُن کی عمر کے آخری آٹھ دس سال ان کی صحت کی خرابی میں گزر گئے اور بالآخر اس باکمال شخصیت نے زمانے کی نامساعدت پر مسکراتے

ہوئے انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ داعی اجل کو لبیک کہا راقم الحروف اُن کے آخری لمحات حیات کے وقت موجود تھا۔ ان کی زبان ذکر الٰہی میں مشغول تھی اور آنکھوں کی غیر معمولی جودت پتہ دے رہی تھی کہ چشم دل اور چشم سر سے اُن کو مقصود حقیقی کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

کسی شاعر کے کلام کو جانچنے کے لیئے میرے خیال میں غزل سے بڑھ کر کوئی اور معیار نہیں۔ لیکن اس دور میں شاعری کا رنگ بالکل بدل چکا ہے۔ حسن و عشق کی داستانوں میں جان باقی نہیں رہی۔ رسمی قصوں اور من گھڑت افسانوں کے سننے کے لیے ذوق ادب تیار نہیں۔ آج شاعری نام ہے، تشبیہ و استعارات میں ایسے معرکتہ الآرا مضامین بیان کرنے کا جس میں عرفان و حقایق کے مسایل ہوں۔ حق پرستی اور اصلاح نفس کے اشارے ہوں اور جو معرفت نفس کا شعور پیدا کرے۔ اس خصوص میں المتی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میری ہستی ہے فقط اس کے ارادے کا ظہور
موج مارے گا اگر دریا حباب آجائے گا۔

فلسفہ ترک تعلق کا ہے آزادی میری
جس جگہ میں مطمئن بیٹھا وہیں گھر ہوگیا

کوئی طاقت ہے کہ بس چلنے نہیں دیتی مرا
جانتا ہوں ورنہ ہر سود و زیاں اچھی طرح

وہ خشوع کیا جو نہ اس قدر بھی میسر آسکے نماز میں
کہ دکھا دے تیری خدائی کو مرے رنگ عجز و نیاز میں
مجھے بس ہے گوشۂ بیکسی ہے بڑے مزے کی یہ زندگی
نہ شریک ہے کوئی سوز میں نہ سہیم ہے کوئی ساز میں
یہ انھیں کے جلوے ہیں سب ولا جو میں کر رہا ہوں برا بھلا
مرے دونوں ہاتھ پھنسے ہیں جا کے انھیں کے دست دراز میں

جسم میں ڈالی گئی جاں دے گئی ہم کو زباں
بولنے سے پہلے ہم پکڑے گئے دیکھا قفس
سر نکالوں آشیاں سے بھی نہ تھی اتنی مجال
ہر جگہ پنہاں رہا میں ہر جگہ پیدا قفس

قرب زاہد کو مبارک ہو یہاں مسجد میں
پہلے آیا ہوں میں گردن کو جھکانے کے لیے

مجھ سے نہ پوچھیے کہ مرے دل میں کون ہے
آئینہ دیکھیے کہ مقابل میں کون ہے

اب تک مقامِ بندہ نہ دیکھا تھا المتقیؔ
آئی نظر زمیں ہی زمیں سر جھکانے میں

تا دیر جو پچھلی کو رہا ان کا تصور
ٹھیری رہی آکر میرے کانوں میں اذاں تک

معلوم نہیں کن خاص جذبات میں المتقیؔ نے یہ شعر کہے ہیں۔

پستی سے بلندی پہ یارب مجھے پہنچا دے
اک ذرہ کو تو چاہے تو خاک سے چمکا دے
آثار تیرے دیکھوں وہ دیدۂ بینا دے
وجدان کو سمجھا دے دل کو مرے ٹھیرا دے
دل ہے مرے پہلو میں لیکن دلِ زندہ دے
کیا کیا نہ دیا تو نے چاہے تو نہ کیا کیا دے

باوجود اس کے کہ حیات انسانی عارضی ہے لیکن اس دوروزہ زندگی میں بعض وقت انسان اپنے وجود پر اترا کر اخلاقِ حسنہ کھو بیٹھتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا وجود فانی ہے اور اگر کوئی چیز یادگار رہے گی تو وہ اس کے اخلاق و کردار ہیں۔ المعیؔ فرماتے ہیں۔

المعیؔ بن کے خوش اخلاق بقا حاصل کر
تو نہ ہو بھی تو زمانے میں ترا نام رہے

انسان جب غرض مند ہوتا ہے تو انہونی بات بھی اس کو ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ غرض مندی کی دھن میں وہ اندھا اور خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کامرانی اور کامیابی کے جو منصوبے وہ باندھتا ہے وہ سراسر دھوکا ہوتے ہیں۔ المعیؔ کس خوبی سے اس چیز کو بیان کرتے ہیں۔

کب ہے اے دل غرض مندی کے دھوکے سے نجات
خاک اڑتی تھی جہاں پانی دکھا کر لے گئی

جب انسان کو کسی چیز کے حصول کی تمنا ہوتی ہے تو وہ اپنی

سعی و کوشش پر بھروسہ کر کے خالق مطلق کی معاونت کے عقیدے میں کمزور ہو جاتا ہے اور اس لئے اس کو ناکامی ہوتی ہے اور جو لوگ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہیں اُن کے کام خود بخود بنجایا کرتے ہیں۔ المتقی فرماتے ہیں۔

بنے بننے والے کام جب دیکھا کہ آخر بن گئے
اٹھ گیا میرا بھروسہ المتقی تدبیر سے

ضائع گئی جہان میں جو تدبیر تھی مری
جو کچھ کیا انھوں نے وہ تقدیر ہو گیا

خیر و شر کے مسئلے میں فلسفیوں کے عجیب و غریب نظریے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اچھائی یا برائی فی نفسہ کوئی شئے نہیں۔ بھلائی اور برائی اعتباری اور فرضی چیزیں ہیں۔ جس چیز کو سوسائٹی اچھا سمجھتی ہے وہ اچھائی ہے اور جس کو بُرا وہ برائی خیر و شر کے اضافی ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے پر ہر دور کے شعرا نے روشنی ڈالی ہے۔ المتقی اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیے

کوئی طاقت ہے کہ بس چلنے نہیں دیتی مرا
جانتا ہوں ورنہ ہر سود و زیاں اچھی طرح

مطالب و معانی کے ساتھ ساتھ زبان کی صحت۔ سلاست و روانی اور محاوروں کا برموقع استعمال المعی کے تغزل کے خصوصیات ہیں چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

کیا مار لیا دستِ حنا بستہ نے دل کو
افسوس کہ ہاتھ کا چالاک نہ ہوتا
امید نے دکھلادی جھلک صبح کی ورنہ
دامانِ شبِ ہجر کبھی چاک نہ ہوتا
اے المعی خود بدظنیاں کرتے ہیں دشمن
دشمن کے لیے ہے، تو خطرناک نہ ہوتا

ڈال بیٹھے مرا ساغر نہ گریبان میں ہاتھ
راہ کرتا کے ذرا گردشِ ایام چلے
آدمی دوڑ چلے اور نہ کھائے ٹھوکر
چاہیئے دیکھ کے ہر بات کا انجام چلے

آتے ہی شبِ ہجر کے' تاروں کی کھلی آنکھ
لو۔ دیکھنے والے مرے انجام کے اٹھے

فلک سے بڑھتے لینے کو سو شہاب کے ہاتھ
اُچھالتا ہے زمیں سے جو اضطراب مجھے
بن اس حسین کی جوانی کی نیند اے شب ہجر
دکھا ستاروں کے آج اڑتے اڑتے خواب مجھے
نہیں ہے عیش و طرب آج اگر مناسب حال
رلائے جا یونہی اے نغمۂ رباب مجھے
سنی کسی نے میری التجا نہ پیری میں
تو ہاتھ پاوں ہی دینے لگے جواب مجھے

رکھ دیا ہاتھ تو پایا دلِ بےتاب نے چین
کیا وہ برسوں ہی ہتیلی پہ جمالاتے ہیں

غرض اس قسم کے بیسیوں اشعار آپ کو ملیں گے جن میں
رفعت تخیل۔ زور بیاں۔ ترکیب کی جدت اور ترتیب کی

موزونیت کے ساتھ ساتھ زبان اور محاورے کی چاشنی بھی موجود ہے اب آپ خود اس پیش کردہ کلام کو ملاحظہ فرماکر اس شاعر کی قادرالکلامی کا اندازہ فرمائیے ۔ والسلام

سید محمود عفی عنہ

محلہ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن ۵ آذر ۱۳۵۵ف

نعت

شانِ رسالت تیری

اب بھی قرآن سے ظاہر ہے وہ حالت تیری
اے رسولِ عربی شانِ رسالت تیری

واسطہ خالق و مخلوق میں خلقت تیری
مشترک سی نظر آتی ہے حقیقت تیری

آخری کیوں نہ زمانہ ہو ترے آنے کا
خلقِ عالم کی ہے تکمیل ولادت تیری

شیر خواری میں برابر کا دیا کرتی تھی
حصّہ فرزندِ حلیمہؓ کو عدالت تیری

ہم نے مانا وہی اعضا کا تناسب ہے مگر
حُسنِ یوسفؑ کو نمک بخش ملاحت تیری

دست و پا صاف بداندیش کے بندھ جاتے تھے
باندھ لیتی تھی نگاہوں میں مروّت تیری
دشمنوں میں کوئی پاتا تھا نہ پھر ایک کو ایک
بول دیتی تھی جو دھاوا کبھی ہیبت تیری
کیسۂ زر کی طرح پیٹ پہ پتھر باندھے
دیکھ لی حضرت طلحہؓ نے وہ دولت تیری
پارہ پارہ ہیں جو لیتی تھی پیالے ٹکّر
اُٹھ کے سونے کے پہاڑوں سے قناعت تیری
غیظ موسیٰؑ نے جو قارون کو کافر مارا
وجہ ایمان سراقہؓ ہوئی رحمت تیری
چشمِ کافر کو چکا چوند رہی رستے پر
رکھ گئی اتنے چراغ آ کے ہدایت تیری
گھاٹ ہے گھاٹ ہے توحید کے پیاسوں کیلئے
آبِ شفاف کا کوثر کہ شریعت تیری

کرتے دیکھیں گی رسولوں کو جو نفسی نفسی
امتیں آئیں گی لینے کو شفاعت تیری

اپنے جسمِ بشری کا تجھے اقرار رہا
کھل گئی پر شبِ معراج لطافت تیری

بخشوانے ہیں تجھے حشر میں امت کے گناہ
المعی پر بھی رہے چشمِ عنایت تیری

۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ جمعہ

بوئے رسولؐ

زبسکہ مستِ محبت ہوں پا کے بوئے رسولؐ
نسیم مجھ کو لگا لے چلی ہے سوئے رسولؐ

ملی ہے ہم کو اسی راہ سے خدا کی راہ
یہی شریعتِ غرّا یہی ہے کوئے رسولؐ

بتایا آپ کا قرآن آ کے خلقِ عظیم
کھلا یہ پھول جہاں میں تو آئی بوئے رسولؐ

بقدرِ حوصلہ ملتا ہے ایک ایک کو جام
شرابِ عشق سے لبریز ہے سبوئے رسولؐ

۱۴ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

جلوا تیرا

دیکھ سکتی تھی نہ یوں عقل تو جلوا تیرا
حق نے معراج کو آئینہ بنایا تیرا

دی گئی خلوت و تنہائی کی تعلیم تجھے
تھی وہ حکمت جو ہوا رات کو جانا تیرا

جب عنایت ہوئے واں قرب کے بازو تجھ پر
رہ گیا دیکھ کے منہ طائرِ سدرا تیرا

ہوتی تھی حدِّ بصر تک ترے مرکب کی اڑان
تازیانہ تھا فقط آنکھ اٹھانا تیرا

واقعہ سے ترے معراج کے جانا بھی تجھے
ورنہ مانے ہوئے ہم آئے ہیں رتبا تیرا

۱۹ رجب ۱۳۴۶ھ جمعہ

شہِ والا اپنا

آج دکھلائیں گے جلوہ شہِ والا اپنا
دیگی عیسیٰؑ کی بشارت بھی حوالا اپنا

جھک پڑے خاک کے طبقے پہ ستارے شب میں
ہاتھ افلاک سے انوار نے ڈالا اپنا

روشن اسلام نے کعبے میں کیے گھی کے چراغ
دن کو اصنام نکالیں گے دِوالا اپنا

آمنہؓ کو خبر اس ماہ نے دی اسریٰ کی
ڈال کر شام کی بستی پہ اُجالا اپنا

قصرِ کسریٰ کے تزلزل سے پریشاں فارس
اور عرب کی ہے صدا بول ہے بالا اپنا

نسخِ ادیان کی تمہید بنی نہرِ فرات
راستہ اور ہی اک اس نے نکالا اپنا

کس قدر سادہ شریعت ہے کہ معراج کی شب
بھر لیا دودھ سے حضرت نے پیالا اپنا

دے سبق خُلق کا عالم کو وہ ناخواندہ یتیم
نور پھیلائے یہ اک لولوئے لالا اپنا

المعیؔ دیکھ اسی طرح سے بن جاتے ہیں کام
فضل کرتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنا

۱۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ جمعہ

ایسا ہی بشر ہے

توحید کے اسرار کی جس دل کو خبر ہے
ہم جیسے ہیں اللہ! وہ ایسا ہی بشر ہے

جس نے کہ سنا تیرا کلام اور تجھے دیکھا
کیا اُس کو ہماری ہی طرح سمع و بصر ہے

آئینے کا پرتو بھی ہے آئینے کا سایہ
اُس جسم تک ایسے بھی نہ سایے کا گزر ہے

تو نے جسے دیکھا وہ محمدؐ نہیں اے آنکھ
تو جس کو فلک جانتی ہے حدّ بصر ہے

یہ تیرا لگایا ہوا اک شجرۂ زیتوں
آدم کا وہ لایا ہوا گندم کا شجر ہے

جاتا جو سرِ کنگرۂ "اُذنِ محمد"
بازو میں کہاں طائرِ سدرہ کے وہ پر ہے

پہلے ہی سر پیشِ خدا تو نے جھکایا
واللہ کہ عالم کی ہدایت ترے سر ہے

پہنچا تو شہا مرتبۂ حقِ یقیں کو
وہ مرتبہ جس میں کہ اگر ہے نہ مگر ہے

۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ جمعہ

سلام

زماں کھینچتے ہیں

عجب آہ شاہِ زماں کھینچتے ہیں — سلامی جگر کی سناں کھینچتے ہیں
کہا شہ نے کوشش ہی یہ اور وہ قسمت — نہ جانا جہاں ہم نشاں کھینچتے ہیں
جھکایا ہماری طرح کس کو جھک کر — بہت آپ کو پہلواں کھینچتے ہیں
نگہ ڈالتے ہیں جو غصے کی حضرت — مقابل کی آنکھوں سے تل جاں کھینچتے ہیں
حوادث کے دریا میں کشتی کا لنگر — اٹھاتے ہیں ہم بادباں کھینچتے ہیں
کہا شہ کہاں ہم نہ زنداں کو جھانکا — نہ کنعاں کا اندھا کنواں کھینچتے ہیں
کھینچے گی قیامت میں آ نہر تو بھی — یہ کوفی تجھے درمیاں کھینچتے ہیں
کہا شہ نے پوچھو نہ صدمے عطش کے — کہ گُدی سے ظالم زباں کھینچتے ہیں
یہ پھندے اسیروں کی آہوں کے اک دن — زمیں پر تجھے آسماں کھینچتے ہیں
کہو قافلے سے کہ منزل وہی ہے — جہاں دل ہم ناتواں کھینچتے ہیں

بیاباں سے گھبرا کے زینبؑ نے پوچھا　　حرم کی قناتیں کہاں کھینچتے ہیں
تڑپنے میں اصغرؑ کا خوں اُڑ رہا ہے　　یہ تصویرِ رنگیں بیاں کھینچتے ہیں
نہ تھا منھ تو کانٹوں پہ کھینچے کا ہم کو
مگر المعیؔ قدرداں کھینچتے ہیں

۱۵ محرم ۱۳۴۲ھ

پانی ٹپکتا ہے

غمِ شبیرؑ میں لہو کا استحالہ ہو تو سکتا ہے
کہ رہ جاتی ہے سرخی آنکھ میں پانی ٹپکتا ہے
ہے سناٹا یہاں پیاسے ہیں پیغمبرؐ کے گھر والے
کٹورا شام کے لشکر میں واں دن بھر کھنکتا ہے
ستمگاروں کے کڑکے جنگ کے میداں میں مت پوچھو
کوئی غش میں پڑی ہے یا کسی بی بی کو سکتا ہے
چلی عباسؑ کی تلوار تو ایسا نظر آیا
کہ جیسے دھوپ میں بہتا ہوا پانی جھلکتا ہے
ابھی ازرق کو دیکھا حملہ آور ہم نے قاسمؑ پر
نہیں دیکھا تھا یوں بجھتا ہوا شعلہ بھڑکتا ہے

نگاہیں لگ رہی ہیں اس طرف پیاسے بچّوں کی
اُدھر ہے نہر کا پانی کہ منھ حسرت سے تکتا ہے

کھڑے عباسؓ جب مارے تعب کے کانپ اٹھتے ہیں
تو رہ رہ کر علم کا دیر تک پنجہ لچکتا ہے

کہا شہؓ نے یہ پیاس اچھی ہے میں پانی اگر مانگوں
اسی خورشید میں اک چشمۂ حیواں چھلکتا ہے

ملی ہے اس کے آگے المعی کس کو بھلا عزت
پیمبرؐ کا گھرانا جب تو آنکھوں میں کھٹکتا ہے

۱۵ محرم ۱۳۴۲ھ

نظر آرہے ہیں

مشیّت کے جلوے نظر آرہے ہیں
سوئے کربلا شہؓ چلے جا رہے ہیں

حمایل جو کی تیغ قاسمؓ نے ہنس کر
یہ سمجھے کہ ہار اُن کو پہنا رہے ہیں

عجب پیاس تھی جس پہ عالم کے دریا
پڑے پیچ و تاب آجتک کھا رہے ہیں

تلاطم ہے نعروں سے مردانِ دیں کے
پہاڑوں سے بڑھ بڑھ کے ٹکرا رہے ہیں

دمِ ذبحِ شہ کون تھا جو نہ دیکھا
رضا اور تسلیم دکھلا رہے ہیں

ابھی اشتر رض کے گھوڑے کو دیکھا ہے کس نے
جو گرد اُٹھتی آتی ہے گھبرا رہے ہیں

کھڑے رن میں عباس رض کرتے ہیں اُف اُف
کوئی آگ سینے میں سلگا رہے ہیں

تجھے زہر سمجھا ہوں اے آبِ دریا
یہ موجیں نہیں مار لہرا رہے ہیں

ملا حلقِ اصغر رض کے قابل نہ پانی
ہم آنکھوں سے آنسو ہی ٹپکا رہے ہیں

کہا شہ رض نے زینب رض سے دیکھو کہ دشمن
بہت پاؤں چادر میں پھیلا رہے ہیں

بیاں کرنے بیٹھے ہیں کس واقعہ کو
وہ آج المعی اک غضب ڈھا رہے ہیں

۱۶ محرم ۱۳۲۴ھ جمعہ

قلب مضطر سے

ہوئی ہر فیض کی نہر یں رواں جس محترم گھر سے
وہ گھر والے رضا دیکھی تو خود پانی کو بھی ترسے
زبانِ خشک پر کانٹا نہیں اک تیر پڑتا تھا
علیؓ اصغرؓ اچھل جاتے تھے خود آغوشِ مادر سے
نگہ عباسؑ کی جس وقت رن میں کام کرتی تھی
پسینے چھوٹنے لگتے تھے تلواروں کے جوہر سے
عجب سایہ یہ تھی اُس دوپہر میں دھوپ کی وحشت
کہیں دیوار سے لپٹا نظر آیا کہیں در سے
جھکا لی آنکھ پردہ کرلیا بانوؑ نے مژگاں کا
سرِ بازار جب آئیں برہنہ سر کی چادر سے

ستمگاروں کے سر جھک گئے عباسؓ کے آگے

زرہ زرہ تنتوں کا سیچ ہے راستہ ہوتا ہے سر پہ سے

چلے پیاسے ہی سنو سنو مرتبہ منھ کھول کر اصغرؑ

بھرینگے جاکے یہ خالی پیالے آبِ کوثر سے

سماں برسات کا دکھلایا شیروں نے میداں میں

جہاں نعرہ کیا گرجے جہاں حملہ کیا برسے

خیالِ حضرتِ عباسؓ پیاسوں کی طرف دوڑا

یہ پانی لے رہا ہے عکس کس کے قلب مضطر سے

گھسے اس گھر میں ظالم لوٹ ڈالا المعیؔ گھر کو

کوئی دستک بھی دے سکتا نہ تھا جس گھر پہ باہر سے

۱۵ محرم ۱۳۴۵ھ

رنج و محن کے

پڑے پالے غربت میں رنج و محن کے
ہوئے شہؓ سے آرام رخصت وطن کے

اذاں صبح کی دے چکے جب کہ اکبرؓ
تو دیکھا کہ گل ہیں چراغ انجمن کے

شہادت کی صبح پریشاں نہ پوچھو
گریباں سے ٹکڑے تھے سب پیرہن کے

شکایت تھی اُن بے زباں بی بیوں کی
گلا بھینچ دیتے تھے حلقے رسن کے

حریفوں کو اتنا ہی پیچھے دبایا
بڑھے رن میں جتنا کہ عباسؓ تن کے

وہ مائیں بجا آج اترا رہی ہیں
ق۱ نہ سمجھی تھیں جو اِن شجاعوں کو جن کے
بنا جن کا ہر ایک ہتھیار زیور
ق۲ یگانے جہاں میں لڑائی کے فن کے
منتیں ایسے۔ خاموش لیتے تھے گھنٹوں
ق۳ مزے جی ہی جی میں سب اپنے سخن کے
فقط جن کو ہنستے مقابل پہ دیکھا
ق۴ مقابل ہوا۔ جو منائے نہ من کے
دمِ جنگ میدان کو روند ڈالا
ق۵ سواری میں گھوڑے بگولے تھے بن کے
جو اے المعی وقت پر حوصلوں کو
ق۶ اگل دیتے تھے اپنے مردانہ پن کے

غرۂ محرم ۱۳۲۶ھ جمعہ

پیغمبری کے بعد

سادات تھے کتاب تھی پیغمبری کے بعد
جوہر کوئی پرکھ نہ سکا جوہری کے بعد

سینہ بھی میر اگر گئی ماتم میں شہؓ کے چاک
دسویں کی صبح اپنی گریباں دری کے بعد

عالم میں نام حضرت عباسؑ کر گئے
کھولا ہے یوں کسی نے علم اس جری کے بعد

دکھلا رہا تھا سب کو پھریرا اٹھا کے ہاتھ
بھاگی ہے فوج نہر سے اس ابتری کے بعد

فرمایا شہؓ نے جب کہ سب اصغرؓ کو رو چکے
لازم ہے صبر ان کی صفِ آخری کے بعد

اصغرؓ سے منہ عرب کی شجاعت کو کیا ہوا
پھیکا پڑا نمک کی اسی کنکری کے بعد

سمجھیں گے کچھ دلوں کا بھی سیدانیوں کے حال
ہم جیسے مبتلا ہوں اگر بہتری کے بعد

اے زر کے زرق برق کیوں بھروا نہ ہو سکیں
آنکھیں یزید کی تری جادوگری کے بعد

جنّت کو المعیؔ نے بھی دیکھا ہے خواب میں
میدانِ کربلا کی مگر سیر ہی کے بعد

۲۹ محرم ۱۳۹۶ھ جمعہ

تقاضا ہوگا

کس قدر ان پہ طبیعت کا تقاضا ہوگا
مجرئی! سامنے جن پیاسوں کے دریا ہوگا
پیاس پر ان کے ہوئے ہونگے یہ چشمے حیراں
پھاڑ کر آنکھ حبابوں نے نہ دیکھا ہوگا
ریگِ سوزاں پہ نہ کیا لوٹ گئی ہوگی موج
بڑھ کے سرِ سنگ سے ساحل نے نہ ٹپکا ہوگا
ہائے وہ دھوپ اگر آج پڑے پانی میں
آج بھی آگ کا شعلہ وہی پیدا ہوگا

۲۴ر محرم ۱۳۲۷ھ جمعہ

غزلیات

روشن چراغ

چاہتی تھی اک نہ اک تاریکیٔ مسکن چراغ
کر دیا اُس کے قدومِ فیض نے روشن چراغ
نرم باتوں سے کسی کی سرکشی چلتی نہیں
پھونک کے آگے جھکا دیتا ہے بس گردن چراغ
حُسن کی گرمی سے یہ جل جائے گا تیرا نقاب
چاٹتا ہے دیکھ دامن کو تہِ دامن چراغ
اُس سراپا نور نے سب گھر کو روشن کر دیا
میرے دروازے کا ہے باہر سے ہر روزن چراغ
پا کے تنہا ہجر میں آنکھیں دکھاتا ہے مجھے
کیا خبر تھی اس طرح ہو جائے گا دشمن چراغ

ہر طرف اڑتے نظر آتے ہیں پروانوں کے پر
رکھ گیا دو چار پھول آخر سرِ مدفن چراغ

ہے توجہ شرط آپ اپنے میں اے دل پائیگا
ڈھونڈھتا ہے جس کو لے کر وادیٔ ایمن چراغ

روشنی پھیلی ہے تو بھی ڈال دے پرتو کے پھول
تیری محفل میں ہے پھیلائے ہوئے دامن چراغ

خشک کرتی ہے لہو فکر سخن اے المعی
ورنہ کیا کوئی جلا سکتا ہے بے روغن چراغ

۲۶ صفر ۱۳۳۱ھ جمعہ

سمٹا ہوا قطرا ہے

ہر طرح سے عالم میں ظاہر ہوا گرایا ہے
پھیلا ہوا دریا ہے سمٹا ہوا قطرا ہے

اُس سروِ سمن بر سے کس بات میں دعویٰ ہے
کیا شاخ ہے گلبن میں کیا سرو میں طرّا ہے

چھپکر نظر آتے ہیں یہ طرفہ تماشا ہے
پردہ بھی حسینوں کا بس آنکھ کا پردا ہے

اے ضبطِ جنوں تیرا ہے پاس فقط ورنہ
پھر دامنِ یوسفؑ ہے اور دستِ زلیخاؓ ہے

دل لیکے اُدھر ہی میں لٹکائے ہوئے رکھا
اُس زلفِ مسلسل کا ادنیٰ سا یہ لٹکا ہے

آتا ہے کہاں سے یہ عالم کو بہا لے کر
وقتِ گزراں بھی اک بہتا ہوا دریا ہے

دیتی ہے مزہ اس کے کاکل کی پریشانی
گویا کہ دھواں سر سے شعلے کے نکلتا ہے

جینے تو کہیں کا بھی رکھتا نہ فلک ہم کو
یہ ڈھیر بھی مٹی کا مرنے کا نتیجا ہے

چھوڑ اس کو بری عادت، مانا کہ ہے معمولی
بڑھ جائیگا آہستہ یہ تیل کا دھبّا ہے

از بسکہ غنیمت ہے تاریکیٔ شب اے دل
آنکھوں میں خیال اس کا اک نور کا تڑکا ہے

اے المعی کہنے کو کچھ چاہیے فرصت بھی
جو کچھ کہ یہ کہتے ہیں ارشاد احبّا ہے

۲۹ صفر سنہ ۱۳۳۱ھ جمعہ

سُنا کرے کوئی

بس یہ ہے اور کیا کرے کوئی
حالِ دل ہی سُنا کرے کوئی

موت بھی چوکتی ہے میں جانوں
تیر تیرا خطا کرے کوئی

اس سے دیکھا ہو کوئی لطف تو خیر
رنج کس بات کا کرے کوئی

کون اچھا بُروں سے رہتا ہے
ہاں! اگر دل بڑا کرے کوئی

گھر پہ کب منحصر ہے وحشتِ دل
جا کے صحرا کو کیا کرے کوئی

مَیں ہوں حالت میں اپنی اور الگ
دیکھ پائے خدا کرے کوئی

دیکھوں کیا لوگ کہنے لگتے ہیں
ذکر میرا ذرا کرے کوئی

اس کی جانب رواں ہی میرا خیال
جیسے پانی بہا کرے کوئی

بے قراری نے کیا قصور کیا
صبر ہی تا کجا کرے کوئی

مجھ پہ ہنستا ہی ہو اگر منظور
دل کو درد آشنا کرے کوئی

اُن کا کہنا وفا کریں نہ کریں
ہے ستم شیوہ کیا کرے کوئی

چاہیے لب پہ ایک بات نہ آئے
یوں ہی حاجت روا کرے کوئی

المعی دشمنوں کا ذکر ہی کیا
دوستی میں گلا کرے کوئی

۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۱ھ سہ شنبہ

مختصر رات

قصہ ہے یہ طول مختصر رات
آ۔ ہجر کی ایک دیکھ کر رات

آنکھوں میں وہ کر گیا ہے اندھیر
مہماں ہے آج میرے گھر رات

چھایا ہے مرا سیاہ خانہ
رکھتی ہے بڑا دل و جگر رات

وعدے کے خیال میں کٹا دن
اب کاٹیے کس امید پر رات

ہے تا بہ کمر جو اُس کی زلفیں
ہے ملک عدم میں دوپہر رات

تو رات کو گھر سے باہر آیا
کیونکر ہوئی تیری پردہ در رات

فرقت میں کہاں تھی نیند بس تھی
چھاتی پہ سوار تا سحر رات

پتلے مرے وہم کے کھڑے ہیں
تاریک ہے آج کس قدر رات

کرتی رہی سائیں سائیں سر پر
کوّے کے لگا کے بال و پر رات

کرتے نہیں دن کو المعیؔ کچھ
کام آتی ہے ان کے بیشتر رات

۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۱ پنجشنبہ

مست شباب آ جائیگا

ضعف پیری آخر، اے مست شباب آ جائیگا
صبح ہو جائے گی سر پر آفتاب آ جائیگا
دیکھنا آ جائیگی ضد اس کی ضد کو دیکھ کر
ہم کو بھی اس لن ترانی کا جواب آ جائیگا
گھر سے کیا نکلوں شب وحشت کہ میرے پاؤں میں
سانپ بن کر راستوں کا پیچ و تاب آ جائیگا
آئینہ منھ دیکھنے لیتا تو ہے وہ نازنیں
کانپتے ہاتھوں میں اُس کے آفتاب آ جائیگا
دوستوں کو چھوڑ جانا شرم ہی کی بات ہے
منھ پہ لے لوں گا کفن مجھ کو حجاب آ جائیگا

چشم ساقی کی محبت رنگ لائے گی دلا!
رفتہ رفتہ ہاتھ میں جام شراب آجائیگا

میری ہستی ہے فقط اس کے ارادے کا ظہور
موج مارے گا اگر دریا حباب آجائیگا

خوف سے خالی نہیں اے المعی دیدار یار
جب نقاب اُٹھ جائیگی اس کو عتاب آجائیگا

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ پنجشنبہ

ویران گھر سے ہم

لیں گے ترا پتہ اسی ویران گھر سے ہم
باتوں میں ہیں لگے ہوئے دیوار و در سے ہم
پیری میں اب ہے تزکیۂ نفس کا خیال
کرتے ہیں کسب نورِ چراغِ سحر سے ہم
وہ اور ہیں کسی کی خطا پر نظر کریں
رکھتے ہیں یاں امید خطا ہر بشر سے ہم
اے ضعف! حیف ہے لب گور آ کے رہ گئے
منزل کو اپنی لے نہ سکے ہاتھ بھر سے ہم
کیا اتنی بات کو بھی سمجھتے نہیں بخیل
بدتر ہیں زندگی میں خرِ بار بر سے ہم

تارِ نفس پہ جھولتے تھے وقت آخر میں
ایسے گرے کہ اُٹھ نہ سکے خاک پر سے ہم

منزل پہ بندگی کی نہ پہنچیں گے المعی
طے بھی کریں جو راہِ اطاعت کو سر سے ہم

۲۵ رجب ۱۳۳۱ھ جمعہ

آغاز سے انجام کا

آج میرے عشق کے آغاز سے انجام کا
فاصلہ ہے اک خرامِ ناز کے دو گام کا
کھُل گئیں آنکھیں جوانی سے ہوئے ہم جب بری
چلتے چلتے صبح کر دیتا ہے بھولا شام کا
دوپہر تک اس گلی میں پھینکتے دیکھا کمند
چڑھ گیا آخر کو دیواروں پہ سایہ بام کا
سینکڑوں اس پہ گزرتے رہتے ہیں ما فی الضمیر
رات دن بہتا ہے رستہ نامہ و پیغام کا

شوال سنہ ۱۳۳۱ھ

(۴)

ڈر نہیں رکھتے

جو زندگی ہے تو مرنے کا ڈر نہیں رکھتے
یہی خیال تو ہم عمر بھر نہیں رکھتے
تباہ حال کہاں تک محبتوں نے کیا
جہاں میں جز دلِ احباب گھر نہیں رکھتے
گئی وُہ دل میں جو تھی سربلندیوں کی ہوس
ہم آسمان ہی بالائے سر نہیں رکھتے
کم اُن کے سامنے خورشید ٹھہر سکتا ہے
کبھی وہ سایہ ہی دو دوپہر نہیں رکھتے
یہی نظر ہے کہ تو مار بھی جلا بھی دے
ہمیں بھی دیکھ کسی پر نظر نہیں رکھتے

بھی ہو "جو شدنی" ہو کہ اپنے کام کو ہم
اُٹھا کے اور کسی وقت پر نہیں رکھتے

یہ کیا مرض ہے وہ اوروں کے رہتے ہیں در لیے
جو لوگ آپ ہی اپنی خبر نہیں رکھتے

کسی کے حد سے تجاوز پر صبر کرتے ہیں
ہزار شکر طبیعت میں شر نہیں رکھتے

وہ غول دور سے رستہ دکھا چلے اے دل!
کوئی چراغ سر راہ گزر نہیں رکھتے

زمانہ المعی کچھ زر پرست ایسا ہے
بہت خراب ہیں جو مال و زر نہیں رکھتے

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ جمعہ

سوزِ دل کا رنگ بھرتے وقت رکھ مانی لحاظ
اک دھواں اُٹھتا نظر آئے مری تصویر سے

بننے والے کام جب دیکھا کہ آخر بن گئے
اُٹھ گیا میرا بھروسا المعی تدبیر سے

۳ رجب ۱۳۲۲ھ جمعہ

تقدیر سے

پھٹ پڑی ہے فصلِ گُل وحشت میں بھی تقدیر سے
چلتی ہے جھنکار کی بیلیں مری زنجیر سے

کب چلی بے تابیوں کی ضعفِ دامنگیر سے
رہ گیا کچھ فاصلے پر دل پھڑک کر تیر سے

مبتلا ہیں سو بُری باتوں میں خود یہ مال دار
ذکر کرتے ہیں غریبوں کا جو اس تحقیر سے

اُف! شبِ وحشت کی تاریکی کہ سر سے پاؤں تک
لیس ڈالا ہے زمین و آسماں کو قیر سے

کیا ہوا جھوٹا اگر باتیں بنا کر بچ گیا
صاف دل ہوتا ہے سچی بات کی تاثیر سے

عصا تھام چلے

قبر تک کون ضعیفی میں عصا تھام چلے
دست و پا اور بھی رہ جائیں تو کچھ کام چلے

پیچ کھاتی رہے اس طرح نہ بکھرا اس کو
سانپ کی چال تری زلف سیہ فام چلے

زندگی تھی کہ جوانی سے بڑھاپا دیکھا
ہم تو یہ جانتے تھے صبح چلے شام چلے

آدمی دوڑ چلے اور نہ کھائے ٹھوکر
چاہیئے دیکھ کے ہر بات کا انجام چلے

ہم کو پڑ جائے پھڑکنے کی یہ عادت صیاد
چار دن اور اسی طرح ترا دام چلے

ڈال بیٹھے مرا ساغر نہ گریبان میں ہاتھ
راہ کترا کے ذرا گردشِ ایام چلے

المعی بن گے خوش اخلاق بقا حاصل کر
تو نہ ہو بھی تو زمانے میں ترا نام چلے

۳ رجب ۱۳۳۲ جمع

وہ راحتِ جاں تک

مر جاؤں، نہ سمجھے مجھے وہ راحتِ جاں تک
ہے دل کی اگر بات تو آئے نہ زباں تک

تا دیر جو پچھلی کو رہا اُن کا تصوّر
ٹھیری رہی آ کر مرے کانوں میں اذاں تک

اک چوٹ برابر کی لگی بانگِ درا کو
جب ہاتھ بڑھایا ہے ہمارے خفقاں تک

ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ

خدا دینے لگے

گر اُنھیں حُسن توجہ کچھ خدا دینے لگے
مری صورت ہی مرے دل کا پتہ دینے لگے
شوق سے جس وقت وُہ ہم کو مٹا دینے لگے
آپ ہی اپنی خبر ہم جا بجا دینے لگے
ٹھاٹ پیری میں بھی ہم اپنا بڑھا دینے لگے
ہاتھ میں زانو کے جُھک کر آئینہ دینے لگے
مطئین پایا جو مجھ کو مہربانی پر مجھے
وسوسے آ آ کے پیغامِ قضا دینے لگے
مر گئے مٹی ہوے لیکن ہوئی دنیا نہ پاک
ہم وبال اپنا سرِ دوشِ ہوا دینے لگے

میں وہ فانی ہوں کہ لکھا جائے تو عبرت کا رنگ
صفحۂ ہستی کو میرا ماجرا دینے لگے

پڑ گئی میری سیہ کاری کو سن کر کھلبلی
ہاتھ اُٹھا کر رونگٹے سب بد دعا دینے لگے

آج کل ایسی ہے کچھ ان کو مرے نالوں سے لاگ
منہ سے نکلے اور اس در پر صدا دینے لگے

دیکھ کر اُس کا کمال کبر ہم اے المعی
کچھ نہ سوجھی حق کے آگے سر جھکا دینے لگے

۱۷؍ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ؍ جمعہ

یارب مجھے پہنچا دے

پستی سے بلندی پہ یارب مجھے پہنچا دے
اک ذرّے کو تو چاہے تو خاک سے چمکا دے

آثار ترے دیکھوں وہ دیدۂ بینا دے
وجدان کو سمجھا دے دل کو مرے ٹھہرا دے

دل ہے مرے پہلو میں لیکن دل زندہ دے
کیا کیا نہ دیا تو نے چاہے تو نہ کیا کیا دے

شعبان ۱۳۳۶ھ

موت کا ڈر بھی

جیتے رہیں جب تک کہ رہے موت کا ڈر بھی
ہم گھر میں ہیں تیار ہے سامانِ سفر بھی
وحشت میں بیاباں سے نہیں کم مجھے گھر بھی
دیواریں ہیں اژدہ تو فقط غار ہیں در بھی
جانے پہ وہ آمادہ ہیں بجتا ہے گجر بھی
اے کشتۂ غفلت کہیں بیدار ہو، مر بھی
دیتے ہیں پتہ ان کو کسی نشو و نما کا
اس باغ کے مرجھائے ہوئے برگ و ثمر بھی
اغیار پریشاں ہیں پریشانی سے اُن کی
کیا ہوش رہا ہے مرے مرنے کی خبر بھی

ہے طرفہ تماشا مری ہر طرح کی کوشش
اور ایک تری کارہ گزاری کی نظر بھی

رویا ہوں تو رویا ہوں کیا صبر تو پھر صبر
رو مرے ہوئے یاں سب ہیں مرے خشک بھی تر بھی

بھولے سے کبھی دل میں وہ آجاتے ہیں میرے
آباد ہوا کرتے ہیں ویران کھنڈر بھی

صحرا میں اڑائے ہوئے لے پھرتی ہے ہم کو
وحشت کو ہماری کبھی لگ جاتے ہیں پر بھی

کیوں عاشق و معشوق میں یہ فرق بلا کا
ہے ایک ہی نسبت کہ اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

لینے کو ازل میں گئے حصہ جو ہم اپنا
قسمت نے کہا درد بھی حاضر ہے یہ سر بھی

اے المعی ہے فیضِ اثر اپنی روانی
دیکھی ہے رواں آبِ مصفا کی نہر بھی

۲۹ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ پنجشنبہ

نیند اُڑا کر لے گئی

ہجر کی شب سب ہماری نیند اُڑا کر لے گئی
چور تھی آنکھوں سے کاجل تک چُرا کر لے گئی
آگے کیا کر لے گی کوشش اور کیا کر لے گئی
میری قسمت مجھ سے ہر بازی جتا کر لے گئی
کب ملی اے دل غرض مندی کے دھوکے سے نجات
خاک اُڑتی تھی جہاں پانی دکھا کر لے گئی
جس جگہ موسیٰؑ سے سرزد ہو گیا دعوائے دید
ہم کو تسلیم و رضا واں سر جھکا کر لے گئی
حیف گل تھا بارِ دوشِ دوستاں میں اور آج
میری مٹی کو ہوا سر پر اُٹھا کر لے گئی

جب ہوئے آنے کو وہ دل میں تو میری آرزو
دل میں ان کو اپنی آنکھوں پر بٹھا کر لے گئی
جوش بے تابی میں جب رخ پر گئے ہم بہ گئے
پھر جب آئی طبیعت میں ، بہا کر لے گئی
لے گئی جب حال دل واں تک مری شایق نگاہ
ضبط خاموشی کی سو مہریں لگا کر لے گئی
لے کے جاتا عشق کو چپ چاپ اس کوچے میں کون
وائے بدنامی کہ جھنڈے پر چڑھا کر لے گئی
مار ڈالا جیتے جی الفت نے اس کی الحفیظ
قبر کو بھی قیر کا پہلو بچا کر لے گئی

۱۹ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ پنجشنبہ

جامے سے باہر ہوگیا

گردِ باد اٹھنے لگے مطلع مکدّر ہوگیا
ہم کو صحرا دیکھ کر جامے سے باہر ہوگیا
ان حسینوں کو تلوّن اور زیور ہوگیا
روتے روتے ہنس پڑے چہرہ گل تر ہوگیا
سُن کے وہ دق ہوگئے میری گراں حالی کا حال
اس قدر سر ہوگیا بھاری کہ پتھر ہوگیا
ہوچکا تھا جب ازل میں کیوں نہ مٹ جاتا یہاں
میرا ہونا ہی یہاں حرفِ مکرر ہوگیا
ہوگئے ہم چُور اِدھر نشے میں عقل و ہوش کے
اور اُدھر اوندھا ہمارا کاسہ سر ہوگیا

کام کرجاتی ہے اپنا کچھ نہ کچھ تاثیرِ حُسن
عکسِ روئے یار آئینے کا جوہر ہو گیا

فلسفہ ترکِ تعلق کا ہے آزادی مری
جس جگہ میں مطمئن بیٹھا وہیں گھر ہو گیا

جب بندھی محفل میں ان کی سرد مہری کی ہوا
جم گیا مژگاں پہ ہر اک اشک گوہر ہو گیا

کاش رہتا یاد اس کو وعدۂ روزِ الست
المعی کیوں ابن آدم بندۂ زر ہو گیا

۲۴ جمادی الاول سنہ ۱۳۳۹ھ جمعہ

بتاں اچھی طرح

خط کو لایا جوش پر حُسن بتاں اچھی طرح
یہ دبی آگ آج دیتی ہے دھواں اچھی طرح

ان کو آتے ہی لگے سو سو گماں اچھی طرح
کر دیا میری حقیقت کو نہاں اچھی طرح

اپنے تیروں کا بنا مجھ کو نشاں اچھی طرح
کھینچ ڈال اب اے ستمگر یہ کماں اچھی طرح

اُن سے اب ملنا ہی بالکل ہو گیا خواب و خیال
سو گئے وہ سن کے میری داستاں اچھی طرح

چشم دل سے دیکھ لوں تم کو تو ہے کچھ لطف دید
کھینچ کے آنے دو ذرا آنکھوں میں جاں اچھی طرح

بیٹھے بیٹھے ہو گئی اُن کی ہماری گفتگو
ہم نے پوچھا خیر ہے بولے کہ ہاں اچھی طرح

واہ اچھے گل کھلائے گرمیٔ فریاد نے
سوکھ کر کانٹا بنی میری زباں اچھی طرح

بارشِ رحمت کے ساماں ہو چکے ہیں میکشو
تاک لینا آج اک اونچی دکاں اچھی طرح

کوئی طاقت ہے کہ بس چلنے نہیں دیتی مرا
جانتا ہوں ورنہ ہر سود و زیاں اچھی طرح

اک نئی صورت مری قسمت کی ہوتی ہے عیاں
جب کبھی کھاتا ہے چکر آسماں اچھی طرح

کیا یونہیں ایک ایک قطرہ چوس لیگا خون کا
دردِ دل لینے لگا ہے چٹکیاں اچھی طرح

۱۱ ذیحجہ سنہ ۱۳۲۹ھ سہ شنبہ

زندگی سے کام نہیں

بہار تک مجھے کچھ زندگی سے کام نہیں
جنوں کی سر میں زمانے سے دھوم دھام نہیں
شکر کی طرح گھلا کر مٹا دے اے شہرت
کسی زباں پہ سنوں میں کہ میرا نام نہیں
ابھی تو عشق مرا دے رہا ہے حسن کا ساتھ
ابھی کہیں مری منزل کا انتظام نہیں

ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ

قرار آئے

کسی طرح شبِ فرقت مجھے قرار آئے
نہ آئے وہ نہ سہی تابِ انتظار آئے
ہمارے نخلِ تمنا میں برگ و بار آئے
خدا کرے کہ پھر ایسی کوئی بہار آئے
نگاہِ ناز نے موسیٰؑ کو کب سنبھلنے دیا
پلٹ پلٹ کے گئے ہوش بھی ہزار آئے
کیا ہے میں نے یہ حاصل کمالِ اوجِ فنا
وگرنہ اڑ کے فلک تک مرا غبار آئے
نہ چبھتے اور نہ کھبتے ہم ان کی آنکھوں میں
بہت بُرا ہے کہ مستوں میں ہوشیار آئے

پکارتی ہے یہی ان کے جاگنے کی ادا
کہ خفتگان عدم کو بھی ہم پکار آئے

دکھاؤں تجھ کو تماشے جہان فانی کے
دلا! میسر اگر چشم اعتبار آئے

سمجھ کے شورش محشر ہی میں تو چونک اٹھا
وہ دھوم دھام سے ایسے سر مزار آئے

طالب شیخ سے کچھ بھی خوش اعتقادوں کو
غریب نقد گئے تھے فقط ادھار آئے

پکڑ لے اٹھ کے نہ دامن ہماری خاک تو خیر
ہوا کے گھوڑے پہ ظالم کوئی سوار آئے

کبھی سوابق حال اپنے المعیؔ مت بھول
اگر زمانہ کوئی تجھ پہ سازگار آئے

۴ صفر ۱۳۴۰ھ پنجشنبہ

پردۂ راز میں

جو حقیقت ان کی دکھا سکے، یہ کہاں ہے تابِ مجاز میں
کہ ظہور بھی ہے حجاب انھیں وہ رہیں گے پردۂ راز میں

یہ لگی ہے دل کی جو راز ہے تو جلائے مجھ کو بھی راز میں
تری شمعِ بزم نہیں کہ میں نظر آؤں سوز و گداز میں

وہ خشوع کیا جو نہ اس قدر بھی میسر آئے نماز میں
کہ دکھائے تیری خدائی کو مرے رنگِ عجز و نیاز میں

مجھے بس ہے یہ گوشۂ بیکسی ہے بڑے مزے کی یہ زندگی
نہ شریک ہے کوئی سوز میں نہ سہیم ہے کوئی ساز میں

یہ انھیں کے جلوے ہیں سب وِلا جو میں کر رہا ہوں بُرا بھلا
مرے دونوں ہاتھ پھنسے ہیں جا کے انھیں کے دستِ دراز میں

وہ کہ جن کے حوصلے تھے بڑے ہوئے کام اُن کے کھرے کھرے
مجھے لاکھ پیچ نظر پڑے اسی ایک زلفِ ایاز میں

مری عقل عشق میں جائے گی تو مرادِ دل بھی بر آئے گی
کہ یہ روشنی سی کھپائے گی مجھے ہر نشیب و فراز میں

وہ نہ آئیں گے مرے سامنے تو پھر ایسے کیوں ہیں بنے ٹھنے
مرا دل نہ خاک سیاہ بنے کہیں اِن کے جلوۂ ناز میں

فقط اس کی طرف خیال ہے کہ جدھر وہ مہر جمال ہے
مری بیخودی میں کمال ہے کہ ہے زاہدوں کی نماز میں

خجل آگے تیرے جو آگیا تو گناہ بخش دیا گیا
یونہیں **المعی** بھی سما گیا ترے عفو بندہ نواز میں

صفر ۱۳۴۱ھ

خاک ڈال کر

دل کا بخار منھ پہ اُنھیں کے نکال کر
دیکھوں تو آج چاند پہ میں خاک ڈال کر
رہ اپنی حد پہ کام ہر اک حسبِ حال کر
آرام چاہتا ہے تو کنبل کو شال کر
ایسا نہ ہو کہ جور کرو عکس ڈال کر
تم آئنے کو ہاتھ میں لو دیکھ بھال کر
زاہد سے مل کے میں نے یہ ظاہر کیا خلوص
گویا کہ آگے ڈال دیا دل نکال کر
وحشت میں جا کے میں بھی ملا کھیلنے لگے
صحرا میں ٹوپیاں جو بگولے اُچھال کر

آگے صدف ہر ایک کے پھیلا رہی ہے ہاتھ
کیا حال کر لیا ہے یتیموں کو پال کر

تیرے بغیر باغ میں کب پھولتے ہیں گل
غنچے مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کر

واں طور تھا کہ حسن کی بجلی سے جل گیا
یاں تو ہی تو ہے پھر ارنی کا سوال کر

غافل سمجھ قدم بقدم کھینچتی ہے خاک
رکھتا ہے کیا زمیں پہ قدم کیا سنبھال کر

خوبی یہ تیری خوب کھلیں گی ستم گری
آ خونِ آرزو میں مرے ہاتھ لال کر

اے المعی گلہ ہی رہا دشمنوں سے کیا
بیٹھے ہیں جب وہ گھر مری قسمت کا گھال کر

۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۳ھ جمعہ

اے صاحبِ لولاک نہ ہوتا

تو ہی اگر اے صاحبِ لولاک نہ ہوتا
افلاک نہ ہوتے کرۂ خاک نہ ہوتا

اس قامت و قد پر جو وہ سفاک نہ ہوتا
برپا کوئی فتنہ تہِ افلاک نہ ہوتا

انساں کو ترے نور نے دی آکے لطافت
یہ خاک سے تھا ورنہ کبھی چاک نہ ہوتا

سب دیکھ چکے تیری سواری کا تجلی
میں بھی ترا وابستۂ فتراک نہ ہوتا

تنکے بھی جو چنتی ہے صبا شاق ہے مجھ پر
کچھ میرے نشیمن کی جگہ خاک نہ ہوتا

یہ چھیڑ تمھاری تھی کہ تم آ گئے دل میں
یوں برق زنِ آئینۂ ادراک نہ ہوتا

اُمید نے دکھلائی جھلک صبح کی، ورنہ
دامانِ شبِ ہجر کبھی چاک نہ ہوتا

تھا بحرِ حوادث مرے ٹخنوں کے برابر
بڑھتا بھی تو مجھ سا کوئی تیراک نہ ہوتا

کیا مار لیا دستِ حنا بستہ نے دل کو
افسوس کہ یہ ہاتھ کا چالاک نہ ہوتا

اے المعیؔ خود بدظنیاں کرتے ہیں دشمن
دشمن کے لیے ہے تو خطرناک نہ ہوتا

۹؍ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ پنجشنبہ

ہنسا رکھا ہے

آپ ہنستے نہیں محفل کو ہنسا رکھا ہے
یہ شگوفہ ہی نیا تم نے کھلا رکھا ہے
ہائے تسلیم نے چھوڑا کوئی بھرپور نہ ہاتھ
ایک تسمہ ابھی گردن میں لگا رکھا ہے
جھپکتی کیوں ہیں اگر چور نہیں ہیں آنکھیں
ان کی پھرتی ہوئی صورت کو چھپا رکھا ہے
سینکڑوں آتے ہیں سینکڑوں جاتے ہیں خیال
دل میں تنہائی نے میلہ سا لگا رکھا ہے
کس قدر نخل انا الحق نے کیا نشو و نما
آج منصور کو سولی پہ چڑھا رکھا ہے

اُن میں کچھ اور بھی ہے ناز و نزاکت کے سوا
جس کو خود ناز و نزاکت نے چھپا رکھا ہے

موت چلّائی جو کھلنے لگے بل نزع میں ہاتھ
لیجئے ساغرِ امید بھرا رکھا ہے

المعی قتل انھیں منظور نہیں تھا نہ کیا
ہم نے سو بار تہِ تیغ گلا رکھا ہے

۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ جمعہ

بہار کے ساتھ

حنا کا کام کریں گے کفِ نگار کے ساتھ
ہرے ہیں پھر مرے زخم آمدِ بہار کے ساتھ

نمود دیکھ مری چشمِ اعتبار کے ساتھ
کہ رہ گئی ہے چراغِ سرِ مزار کے ساتھ

ہر اک عزیز کو میرے جدا ہوا مرا غم
جہاں میں کتنے تعلق تھے جانِ زار کے ساتھ

نہیں گریز تو رہتا ہے ان کا دامنِ ناز
کھنچا کھنچا مرے اُڑتے ہوئے غبار کے ساتھ

چلے ہیں ان کی طرف اک امیدِ پر ارماں
کہ جیسے مُردے قیامت کی اک پکار کے ساتھ

کوئی چھیڑا سے یہاں آکے دستِ وحشت کو
الجھ رہا ہے گریباں کے تار تار کے ساتھ

نہ جھک سکیں جو کبھی ہوں کسی سے چار آنکھیں
چلو وہ چال زمانے میں ہم بھی چار کے ساتھ

غریب خون کا قطرہ ہے نوکِ نشتر پر
چلا ہے چھد کے مرا دلِ نگاہِ ناز کے ساتھ

نہ اٹھی مئے احساں میں نمک نہ ملا
بنا نہ سرکہ اک اندازِ ناگوار کے ساتھ

۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ جمعہ

پاروں میں

چل دلا بازارِ فروشی ہی سہی پاروں میں
آج وہ حسنِ جہاں سوز ہے بازاروں میں
پھر بہار آئی ہے شاید کہیں گلزاروں میں
بلبلیں تنکے لئے جاتی ہیں منقاروں میں
اپنے دامن کے مقابل نہ سرا ہوا اُس کو
کھینچی جاتی ہے نسیمِ سحری خاروں میں
ہر طرف سے رہی اس بزم میں چشمک ہم پر
گھس پڑے ہم انھیں چلتی ہوئی تلواروں میں
اس قفس میں کہاں راحت و آرام اے دل
دے دیا ہے تری ہستی نے مجھے آروں میں

دیکھتے تھے وہ مرے شوقِ شہادت کا چمن
خوں دکھایا ہے اڑا کر انہیں فواروں میں

شاہدِ ناز پکارا کہ نہ بڑھ ہوش سنبھال
کون بیہوش رہا طور کے نظاروں میں

الٹی دل میں یہ دیتے نہیں رخسار کو راہ
کیا بُرا عیب ہے ان آئینہ رخساروں میں

۳۰ ربیع الثانی ۱۳۲۱ھ جمعہ

ہو تو سہی

لب پہ آتشکدۂ دل سے گزر ہو تو سہی
نالہ اک وادیٔ ایمن کا شجر ہو تو سہی
اس کی بخشش کا یہ کہنا کہ کرے لاکھ گناہ
ہاں! مگر دل میں گنہ گار کے ڈر ہو تو سہی
رات کی مردہ تمنائیں مری جی اُٹھیں
یہ سحر روزِ قیامت کی سحر ہو تو سہی
اپنے جذباتِ محبّت کو نہ رکھوں بے کار
تیری زلفوں کی بلا ہی مرے سر ہو تو سہی
اُن پہ مرنا مجھے منظور ہے مر جاؤں گا
بد دعا میں مرے دشمن کے اثر ہو تو سہی

میں دکھلانے کو تیار ہوں دِل کی حالت
پہلے اس دیکھنے والے کو نظر ہو تو سہی

میری شمع دِل سوزاں پہ ہے آج ان کی نگاہ
یارب اس تیرہ بیں پروانے کا پر ہو تو سہی

مست لے جائے نہ ساقی مجھے مئے خانہ میں
میں کہاں ہوں مجھے اتنی بھی خبر ہو تو سہی

اور تو اور نہ پھٹکے کوئی وحشت میں خیال
دِل کو یوں آج اجاڑوں کہ کھنڈر ہو تو سہی

ہم سبکسار نہ جائیں گے گنہ ہو کہ ثواب
الفتی ساتھ کوئی زادِ سفر ہو تو سہی

۱۴ جمادی الاول ۱۳۴۰ھ جمعہ

پروانے کو

منھ سے کچھ بھی نہ کہا شمع پہ جل جانے کو
پر مگر اس نے الگ دے دیے پروانے کو
گرد کلفت کی زمانے سے ہے بہ جانے کو
موسلا دھار ہوں مینھ آنکھ سے برسانے کو
خواب پھر یوسفِ مصری کا نہ دیکھو تو کہوں
سوتے سوتے ہی سنو تم مرے افسانے کو
چھوڑ کر دل میں چلے جاو ہزاروں ارماں
بات جب ہے کہ بسا دو مرے ویرانے کو
چاہتا تھا مجھے لے جائے جہاں نشۂ مے
اب تو غش آتے ہیں ساقی وہیں لے جانے کو

درد اٹھا ہے کہ یاد آئی ہے ان کی دل میں
بجلیاں کوند رہی ہیں مجھے تڑپانے کو

حسرتوں کو مری قتل اور نہ پامال کیا
تم نے مہندی نہ لگائی مرے گھر آنے کو

چھوڑ دے قرب کی سرحد سے دلا عقل کا ساتھ
آگے بڑھنے کی اجازت ہے تو دیوانے کو

المعی عشق نے جب تک کہ نہ بدنام کیا
عقل آئی مجھے انجام نہ سمجھانے کو

جمعہ
۱۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۱ھ

ادا کیے ہیں

عادی عبادت بدنی کی ادا کیے ہیں
ہاتھوں سے ہم ٹٹولنے والے خدا کیے ہیں
رہرو اگرچہ شیخ بھی راہِ خدا کیے ہیں
پہنچے وہ دسترس میں کہاں ہر عصا کیے ہیں
اونچا کرے وہ پست کو نیچا بلند کو
گوشے وہاں ملے ہوئے ارض و سما کیے ہیں
مجبور ہیں اٹھاؤ تو اٹھیں گے حشر میں
مارے ہوئے بھی آج تمھاری ادا کیے ہیں
اے ضعف! وقت نزع نکل جائینگے ضرور
کچھ حوصلے جو اور مرے دست و پا کیے ہیں

دل کو چمک نے درد کی اکسیر کر دیا
نسخے یہ چٹکیوں میں کئی کیمیا کے ہیں

ناز ان کو منہ سے بولنے دیگا نہ کچھ مگر
تم ان پہ مر مٹو یہی معنی رضا کے ہیں

دھو کر بھی پاک کر نہ سکیں ان کو شوخیاں
چہرے پہ آج تک ترے دھبے حیا کے ہیں

ہم ہو گئے عیاں جو ہوا ان کا سامنا
گویا کہ اک شعاع میں جلوے ہوا کے ہیں

رہیئے خدا کی راہ میں اے المعی ذلیل
اس کے سوا لباس ہیں جتنے ریا کے ہیں

۲۶ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ جمعہ

اچھا قفس

کر دیا تیار، آخر غم نے اک اچھا قفس
ہوتے ہوتے تنگ مجھ پر ہو گئی دنیا قفس
بن گیا ہے اک کبوتر یہ مرے پر کا قفس
ورنہ مجھ سے مشتِ پر کی کیا اسیری کیا قفس
جسم میں ڈالی گئی جاں دے گئی ہم کو زباں
بولنے سے پہلے ہم پکڑے گئے دیکھا قفس
شکر کر اے دل پھڑکنے کی ہی گنجائش ملی
دم نکل جاتا جو مٹھی بند کر لیتا قفس
پتے پتے سے چمن لگے ہے مجھے وابستگی
ڈالی ڈالی سے ہیں لٹکائے ہوئے صدہا قفس

قدر اس قیدِ قفس کی اب مجھے ہونے لگی
جبکہ تیروں کا حوادث کے بنا تودا قفس

بے تحاشا دل میں آ کر پھنس گیا ان کا خیال
کیا خبر تھی، ہے یہ کس طائر کے رہنے کا قفس

عمر بھر یوں ہی جھلائے گی زمانے کی ہوا
اب تو ہے ان نو گرفتاروں کو گہوارا قفس

سر نکالوں آشیاں سے بھی نہ تھی اتنی مجال
ہر جگہ پنہاں رہا میں، ہر جگہ پیدا قفس

کر دیا مشکل کو حل عادت نے اپنی المعیؔ
مجھ کو آزادی سے نفرت مجھ سی بے پروا قفس

۱۰ رجب ۱۳۴۱ھ جمعہ

دِل بر کی تلاش

ہے مجھے مقصود ہی مذہب سے دل بر کی تلاش
مدرسے والوں کو اک پارینہ دفتر کی تلاش
گردشِ قسمت بھلا دے گی ہماری مستیاں
چاک پر اِک دن چڑھا دیگی یہ ساغر کی تلاش
چونک کر جلوے سے اُن کے کیا کہوں دل کیا ہوا
صبح کی بڑھتی سفیدی اور اختر کی تلاش
ہائے یہ دھن تھی کہ رہ جائے نہ کوئی آرزو
ڈال کر ہاتھ اس نے میرے دل کے اندر کی تلاش
وہب نے آواز دی بے قصد جو آجائے پائے
میں نے اس یوسف کی جا کر جس کنویں میں کی تلاش

خونِ دل ہے کس قدر ہوتی نکالے دل کر
قدر کے قابل ہے میرے دیدۂ تر کی تلاش

سانپ بن کر کس ہوا میں اور یہ لہرائے گی
ان کی زلفوں کو ہے یارب کس فسونگر کی تلاش

دین پر ہوتے ہیں دنیادار بھی مائل ـ مگر
جیسے بچوں کا تجسس اور بندر کی تلاش

باندھ کر دامن میں یاں رکھا شبِ غم نے مری
پڑ گئی واں چرخ پر خورشیدِ خاور کی تلاش

کام دے گا بس یہی ایمان بالغیب المعی
عالمِ ظلمات میں جیسے سکندر کی تلاش

۲۲ رجب ۱۳۳۰ھ یکشنبہ

ہو نہیں سکتا

کہتے ہیں جسے دل وہ زباں ہو نہیں سکتا
میں جو نہیں سمجھا ہوں بیاں ہو نہیں سکتا
بے تاب ہے جی ضبطِ فغاں ہو نہیں سکتا
رعب ان کا مری مہر وہاں ہو نہیں سکتا
ہمراہ یقیں دیکھنے جاتے ہیں وہاں ہم
جس جا کوئی ہونے کا گماں ہو نہیں سکتا
کیا ؟ تم نے عطا کی ہو جسے عشق کی ہستی
وہ نقطۂ رازِ دو جہاں ہو نہیں سکتا
میں ذوق میں کہتا ہوں بتا ان کی حقیقت
کہہ دیتی ہے چشمِ نگراں ہو نہیں سکتا

رخسار پہ کیسے تری زلف آگئی بڑھ کر
جب تیز ہو شعلہ تو دھواں ہو نہیں سکتا

آتے ہی تمہارے تھا دل ارمانوں سے خالی
ایسا کہ کوئی ہُو کا مکاں ہو نہیں سکتا

کیا جذب کیا ذائقہ دید کو اے دل
کچھ بھی مری آنکھوں سے عیاں ہو نہیں سکتا

صحرا میں وہ اٹھتے ہوئے دیکھتے ہیں بگولے
خود مجھ کو بھی ایسا خفقاں ہو نہیں سکتا

آنسو ہیں کہ آنکھیں مری پی ہی نہیں سکتیں
خوں ہے غذائے رگِ جاں ہو نہیں سکتا

اے شمعؔ جھکنا ہی مناسب ہے کہ کوئی
پیری میں اکڑنے سے جواں ہو نہیں سکتا

۸ شعبان ۱۳۴۴ھ جمعہ

دکھلاتے ہیں

دل کو ہم بھی حرمِ یار دکھلاتے ہیں
ڈوب کر غیبِ ہویّت کا پتہ لاتے ہیں
بادلوں میں ترے کیا جذب ہی ایسے ہو ہم گل
میکدے تک تو یہ توبہ کو لگا لاتے ہیں
رکھ دیا ہاتھ پہ یا دلِ بیتاب نے چین
کیا وہ سرسوں ہی ہتھیلی پہ جما لاتے ہیں
میں تو سدھ بدھ کو وہیں پھینک کے چل دیتا ہوں
آتے جاتے مرے احباب اٹھا لاتے ہیں
ان کی تنہائی کے دشمن ہیں جرس کے نالے
دشت میں قافلے منزل کے بلا لاتے ہیں

لا سکے تجربہ کاروں کو بھلا دام میں کون
ترے لٹکے مگر اے زلف رسا لاتے ہیں

ان کو آتے ہوئے دیکھ کے بس سہم گیا
ایسے آئے ہیں کہ پیغام قضا لاتے ہیں

مل تو جائیں ترے شیشوں کی یہ پریاں ساقی
رند پھر تخت سلیماں کو اڑا لاتے ہیں

ان کے بازار میں اے المعیؔ گاہک ہیں بہت
جھوٹی سچی کئی باتیں جو بنا لاتے ہیں

۱۰ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۲ھ پنجشنبہ

یہ بھی

دلا! ان کی توجہ پر ہجوم مدعا یہ بھی
صدا ہے گوشے گوشے سے ذرا یہ بھی ذرا یہ بھی

کہا رندوں نے محویت میں جب مسجد سے ہم نکلے
چلے آتے ہیں میخانے سے اٹھ کر پارسا یہ بھی

پڑے بے فکر و بے غم لوٹتے دیکھا فقیروں کو
مگر ہے لوٹنے کی جائے ان کا بوریا یہ بھی

نہ کر اظہار راز عشق پی جا اس کو اے ناصح
ارے ناداں ہے اک جرعۂ آب بقا یہ بھی

بجھایا عکس رُخ نے ہاتھ رکھ کر شمع محفل کو
بڑی جرأت سے کرنے آئی تھی کسب ضیا یہ بھی

کبھی مئے ہے کبھی توبہ غرض آزادہ رو ہیں ہم
ضرورت پر روا وہ بھی ضرورت پر روا یہ بھی

یقین آتا نہیں زاہد کو "دین اللہ" پر
تو پھر سر پھوڑنے اچھا ہے پتھر کا خدا یہ بھی

مثالِ شاخِ گل اک روز جھک کر کھاؤ گے جھونکے
جوانوں کو سنا دے جاکے اے بادِ صبا یہ بھی

نسیمِ صبح کے چلتے ہی کیونکر پھول کھل جاتے
نہیں تھی آپ کے باریک دامن کی ہوا یہ بھی

شبِ وحشت میں آہوں سے رہے چھٹکے ہوئے تارے
مرے گھر المعی اچھا رہا اک جھٹپٹا یہ بھی

۲ ذیحجہ سنہ ۱۳۴۰ھ جمعہ

کم دیکھتے ہیں

تری مہربانی جو کم دیکھتے ہیں
ہر امکان کو ہم عدم دیکھتے ہیں
عجب پیچ تاب آج ہم دیکھتے ہیں
شب غم کی زلفوں کے خم دیکھتے ہیں
کلیجے کے ٹکڑے دکھاتا ہوں ان کو
جو اہر کی اک اک رقم دیکھتے ہیں
وہیں سر چھپاتے ہیں مئے خوار جاکر
جو دامانِ ابرِ کرم دیکھتے ہیں
یہاں آکے جب سے دیکھا ہے تم کو
یہ سارے زمانے کے غم دیکھتے ہیں

شریفوں کے اخلاق جچتے تھے پہلے
مگر آج دام و درم دیکھتے ہیں

تأمل تماشے دکھاتا ہے ہم کو
ہر اک جام کو جامِ جم دیکھتے ہیں

وہ پکڑے گئے ہم کو اے دل ہٹا کر
سب اُن کے نشانِ قدم دیکھتے ہیں

خیال آتے ہیں ہم کو وحشت میں اُن کے
غزالانِ وحشی کے رم دیکھتے ہیں

ڈرے وہ بہت اس چمن کی ہوا سے
کہ غنچوں کا مٹھی میں دم دیکھتے ہیں

زیادہ نہ بھول المعی واہ واہ پر
ترے عیب احباب کم دیکھتے ہیں

کیا کہیں

رکھدیں گلا ہی تیغِ دو پیکر سے کیا کہیں
آنکھیں دکھا رہا ہے تو جوہر سے کیا کہیں
پھرتے تھے جستجو میں تری دل کو گم کیا
یہ ہاتھ پاؤں رکھ کے مقدر سے کیا کہیں
ارمان رو رہے ہیں تجھے دل میں دیکھکر
نکلے تھے کیا سمجھ کے ہم اس گھر سے کیا کہیں
بولی صبا کہ منہ سے لگائیے ہزار کان
اس نازنیں کی بات گُلِ تر سے کیا کہیں
ملنے کی ایک دن یہی کھینچنا تو ہے دلیل
ملنے کو اس کھچے ہوئے خنجر سے کیا کہیں

کیوں مثلِ جامِ بزم میں آنکھیں پھٹی رہیں
کیوں خوں ہو گیا دلِ مضطر سے کیا کہیں

خاموش سجدہ کرتے ہیں ہم اُن کو دیکھ کر
پتھر بنے ہوئے ہیں وہ پتھر سے کیا کہیں

دل ہی تڑپ سے ہجر کی پاؤں میں آ گیا
پچھلے پہر کے بھاگتے لشکر سے کیا کہیں

کرلیں گے اس نگاہِ توجہ سے عرضِ حال
لیکن جو تیز ہیں تیور سے کیا کہیں

ہے جھوٹ ہی تو ظلم کی بنیاد المعی
جھوٹا سمجھ چکے ہیں ستمگر سے کیا کہیں

غرہ محرم ۱۳۴۰ھ جمعہ

آسماں پر

آج اُن کا برق زن ہے جلال آسماں پر
بادل کی کھینچتے ہیں وہ کھال آسماں پر
پھیلا ہوا ہے زلف کا جال آسماں پر
اے آہ پاؤں دیکھ کے ڈال آسماں پر
ہر اک سے ان کا بام یہ اظہارِ انکسار
گویا کہ عید کا ہے ہلال آسماں پر
یاں کی طرح نہ جا کے ہوا پھیلنا نصیب
نقطہ ہے آدمی کا خیال آسماں پر
اے زہد بے ریا تجھے سمجھے ہوئے ہیں ہم
چادر میں سر چھپا کے نکال آسماں پر

سوجھی صبوح کی نظر آنے لگا مجھے
دامن بیاض صبح کا لال آسمان پر

دن ڈوبتے ہی ہائے سیاہی اتر پڑی
کھولے شب فراق نے بال آسمان پر

گننے کو میں نے رات کی گھڑیوں کے چن لیا
تاروں کا پہلے تھانہ کال آسمان پر

ساقی! جو دے خمار مرا دو ہی گردشیں
چڑھ جائے تیرا جام سفال آسمان پر

جب نالہ ہو گیا ہے مرا آسماں کے پار
اک تازہ لگ گیا ہے نہال آسمان پر

یہ جور و ظلم انھیں کے ہیں دنیا میں المعی
ہم جھونکتے ہیں ان کا وبال آسمان پر

۱۳ محرم ۱۳۴۱ھ چہار شنبہ

آ ہی گئی

دل حزیں میں امید ایک بار آ ہی گئی
چمن کھلانے کو بادِ بہار آ ہی گئی
بہت خلوص سے احباب نے دیا مرا ساتھ
میں کیا کروں مری ہمت کو عار آ ہی گئی
ہوئی غضب کی ندامت شراب خواروں کو
سروں پہ رحمتِ پروردگار آ ہی گئی
رہی نہ زلفِ پریشان کی توسنی کی ہوا
کہ دستِ شانہ میں اک دن مہار آ ہی گئی
نسیمِ صبح کے دامن کی آڑ لے لینا
حیا چمن میں جو اے گل عذار آ ہی گئی

لبوں پہ لاکھ تامل تھے جان کو آنے میں
مگر یہ آپ کی امیدوار آہی گئی

چھپا سکے نہ وہ غصّے کو اُن کی آنکھوں میں
اُبل اُبل کے مئے خوش گوار آہی گئی

وہ لے لیا مرا دل برچھیوں کی نوکوں پر
وہ سامنے صفِ مژگانِ یار آہی گئی

ہزار دیکھ لئے المعیؔ نے راحت و رنج
سمجھ میں گردشِ لیل و نہار آہی گئی

۲۸ محرم ۱۳۴۱ھ پنجشنبہ

یاد نہیں

کشمکش نے مرا کیا حال کیا یاد نہیں
ضبط کی تاب نہیں تھی لب فریاد نہیں
ورنہ ممکن ہے کہ ہو درد میں لذت اول
ان کی عشاق پہ رحمت ہے یہ بیداد نہیں
کیا ہوا چاہنے والے جو بہت ہیں تم کو
میرے دشمن بھی تو دس پانچ ہیں ایک آدھ نہیں
حسن اور عشق کے جھگڑوں نے کیا دل کو خراب
جب سے آباد ہے دنیا یہ گھر آباد نہیں
کیسے ہیں آراستہ پیراستہ خوبانِ جہاں
کسر اتنی ہے کہ وہ جذبِ خداداد نہیں

تم الگ ہو گئے پھر کس نے پھنسایا دل کو
زلفیں کہتی ہیں کہ ہم دام ہیں صیاد نہیں

قدِ رعنا کی نسیمِ سحری لہرا دے
چمنِ حسن میں ایسا کوئی شمشاد نہیں

کیوں جواب ان کو دلا! تو نے دیا روزِ الست
وہ تو نوٹس تھی کہ تم آج سے آزاد نہیں

تم نے آخر مجھے بدبھی تو نہ مشہور کیا
اس عمارت کی ہوا پر بھی تو بنیاد نہیں

المعیؔ اپنے مقدر کا بھروسا اچھا
ہم کسی سے بھی یہاں طالبِ امداد نہیں

۱۱ر صفر ۱۳۴۱ھ سہ شنبہ

تیر چلانے کے لئے

پھر گئی آنکھ جدھر تیر چلانے کے لئے
رکھ دیا ہم نے وہیں دل کو نشانے کے لئے
سخت جانی مری کام آگئی آخر اے دل
ان کی تلوار کو پتھر ہی چٹانے کے لئے
شکر ہے یہ بھی، نہ دیتا تو میں کیا کر لیتا
غصہ پینے کے لئے، غم مجھے کھانے کے لئے
بدگمانی مری بیتاب ہے لیجائیے ساتھ
چار کوچے ہی اُسے آج جھکانے کے لئے
چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کے ادائیں اُن کی
دل کو ملتے ہیں وہ اکسیر بنانے کے لئے

سوختہ دل ہوں میں ایسا نہیں بارود سے کم
اک نظر بس ہے مجھے بھک سے اڑانے کیلئے

قرب زاہد کو مبارک ہو یہاں مسجد میں
پہلے آیا ہوں میں گردن کو جھکانے کیلئے

کھینچ لیتے ہیں وہ دامن کو سرک جاتے ہیں
شاخِ گل بڑھتی ہے جب ہاتھ ملانے کیلئے

ناز نے ان کی صدا دی جو وہاں پہنچے ہم
حشر ہی چاہیئے اب آنکھ اُٹھانے کیلئے

چرخ پر غم کی چڑھائی ہے کہ میرے لب تک
نالہ پہنچا ہے نشاں اپنا چڑھانے کیلئے

المعی دست حنا بستہ قاتل ہیں بہت
چاٹ پر خون کی قاتل کو لگانے کے لئے

۲۷ صفر ۱۳۴۱ھ پنجشنبہ

نادان بہت ہیں

ہم بولتے ڈرتے ہیں وہ نادان بہت ہیں
چوری کو چھپایا ہے پریشان بہت ہیں
کچھ عرش سے اونچا تو نہ جائے گا تصور
ایسے مرے دیکھے ہوئے میدان بہت ہیں
دکھلاؤں ابھی ناؤ میں عالم کو بٹھا کر
آنکھوں میں مری نوح کے طوفان بہت ہیں
سمجھے ہوئے مرنے کو ہوں مرنا ترے آگے
جو کچھ کہ ہیں باقی مرے ادسان بہت ہیں
اغیار کی محفل میں جگہ ہے مری دل میں
ہوں خوش یہی اسی پر کہ وہ انجان بہت ہیں

وحشی تو نہیں تیرے اشارے سرِ محفل
ابرو سے ترے دست و گریباں بہت ہیں

کیا جانئے کیا بات پسند آئی ہے دل کو
اس شکل و شباہت کے تو انسان بہت ہیں

ناچیز ہے وحشت مری کیا خاک اُڑا دوں
اس خاک کے ذرّے میں بیابان بہت ہیں

سنتے ہی کسی شخص کی باتوں میں نہ آنا
اے المعی بہکانے کو شیطان بہت ہیں

۲۷ر ربیع الاول سنہ ۱۳۴۱ھ جمعہ

نکل کر

پہنچا ہے فلک پر دلِ مضطر سے نکل کر
سیدھا مری آہوں کا دھواں سر سے نکل کر

زیور نے بنایا نہ تمھیں بلکہ چھپایا
آجاؤ ادھر پردۂ زیور سے نکل کر

چمکا تو دیا ہے مجھے صدماتِ جہاں نے
چنگاریاں بجھ جاتی ہیں پتھر سے نکل کر

اک تیر دلِ مضطر و بے تاب پہ مارا
پنجہ ترے بگڑے ہوئے تیور سے نکل کر

پیاسوں کی طرح میرا لہو چاٹ رہے تھے
شعلے دمِ بسمل ترے خنجر سے نکل کر

کھینچے ہوئے دامن کو وہ چلتے تھے چمن میں
بو پھیلتی آتی تھی گُل تر سے نِکل کر

مانا کہ بہت دور ہوں لیکن مِری منزل
جائے تو مرے پاؤں کے چکّر سے نِکل کر

شب کو جو فلک کی طرف اُٹھیں مری آنکھیں
اک تیر پڑا دیدۂ اختر سے نکل کر

اک خاک کے اوپر ہے تو اک خاک کے نیچے
اے المعی جائیگا کہاں گھر سے نِکل کر

۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۱ پنجشنبہ

حسرت رکھے

اس کو لازم ہے جو میخانے کی حسرت رکھے
پہلے اک پیر مغاں سے بھی ارادت رکھے
آدمی کے لئے کافی نہیں یہ صورت و شکل
چاہیئے دل میں ذرا سوز محبت رکھے
بندگی ہم کو بصد جان و دل اس کی منظور
آپ کی سی جو دلوں پر بھی حکومت رکھے
عشق کی آگ میں ہم جھونک چکے ہیں دل کو
کام اس کا ہے جلا دے کہ امانت رکھے
ناصحوں کو نہیں کچھ حکمت تخلیق کا پاس
مرنے دو اس کو جو مرنے کی لیاقت رکھے

کفر و ایمان سے عاشق کو سروکار نہیں
آدمی ہو تو کوئی مذہب و ملّت رکھے

حُسن اور عشق ہی دلچسپیِ عالم کے ہیں راز
میں رہوں اور خدا تم کو سلامت رکھے

پھر تو دنیا پہ قیامت کا بھی آنا معلوم
پاؤں پر پاؤں اگر اُن کے قیامت رکھے

المعی ہوتے ہیں از بسکہ حسین گرم مزاج
ان سے بہتر ہے کہ تو آگ سے صحبت رکھے

۲۲ ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ پنجشنبہ

پیچ و تاب مجھے

دیا ہے کاکلِ پرخم کا پیچ و تاب مجھے
کیا ہے گردشِ دوراں نے انتخاب مجھے
فلک سے جھکتے ہیں لینے کو سو شہاب کے ہاتھ
اچھالتا ہے زمیں سے جو اضطراب مجھے
ملا نہ دل تو حسینوں سے مل گئے یوں دیکھا
بغل میں عشق کی دابے ہوئے کتاب مجھے
بنِ اس حسین کی جوانی کی نیند اے شبِ ہجر
دکھا ستاروں کے آج اڑتے اڑتے خواب مجھے
جو لی شباب کی اس شہ سوار حسن نے باگ
تڑپ گیا کہ زیادہ نہ اور داب مجھے

کسی کے عشق میں پایا ہے مجھ کو جب یکسو
دکھائے منھ نہ زمانے کا انقلاب مجھے

نہیں ہے عیش و طرب آج اگر مناسب حال
رُلائے جا یونہیں اے نغمۂ رباب مجھے

ہے برق طور کا صدمہ ابھی دماغ کو یاد
کئی کئی نظر آتے ہیں آفتاب مجھے

درِ فلک مری آہوں پہ کھول دے اے صبح
کسی کے ظلم کا کرنا ہے سدِّ باب مجھے

سُنی کسی نے مری المعیٰ نہ پیری میں
تو ہاتھ پاؤں ہی دینے لگے جواب مجھے

۸ ہر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۱ھ جمعہ

ہو نہیں سکتا

سبکدوش اس صفائی پر مرا دل ہو نہیں سکتا
تمہارا مثل آئینے سے باطل ہو نہیں سکتا

یہ فطرت ہے کہ رہ سکتے نہیں اور جانتے ہیں ہم
ہمارے آہ و نالہ سے وہ حاصل ہو نہیں سکتا

الجھنے لگ گئی ہے ضعف سے خود راہ پاؤں ہیں
کوئی مجھ سا گرفتارِ سلاسل ہو نہیں سکتا

پڑینگی دل کے پیچھے جھاڑ کر پنجے مری آنکھیں
نیستان ہیں یہ شیروں سے مقابل ہو نہیں سکتا

نہ دیکھا آج تک تھمتے ہوئے اسکی ترقی کو
مہ حسن المعی سچ ہے کہ کامل ہو نہیں سکتا

۱۵ / جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ جمعہ

گیسو ہوگیا

سر پہ لہرانے لگا حوروں کا گیسو ہوگیا
ابر کالا کہ مری توبہ کا لاگو ہوگیا

دیکھیے کس کس کے ارمان دیکھے اب سُنیگی وہ
آنکھ کو گردش ہوئی تیار کولھو ہوگیا

میں نے تو کچھ دشت وحشت میں نکالے ہاتھ پاؤں
ریت پر لوٹا مرا سایہ تو آہو ہوگیا

شیخ کے آگے ادب سے جا کے چپ بیٹھے ہیں ہم
منہ نظر آنے لگا آئینہ زانو ہوگیا

حضرت ناصح کو ہاں ہاں کہدیا خوش ہوگئے
میں ادھر خوش ہوں کہ سیدھا میرا الّو ہوگیا

اِنکی نفرت میری اُلفت دونوں تُل کر رہ گئے
چھید کر تیرِ نگہ دل ترازو ہو گیا
روتے روتے المعی دل کی کدورت بہ گئی
یک بیک بیڑا مرے دریا میں ٹاپو ہو گیا

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۲۱ھ جمعہ

کم نہ ہو جائے

رقیب سے تری وحشت یہ کم نہ ہو جائے
کہیں یہ آنکھ غزالِ حرم نہ ہو جائے
وہ دل مرا کہ نہ لی آج تک خبر میری
تمہارے ہاتھ میں اب جامِ جم نہ ہو جائے
خدا کرے کہ مرے منھ سے شعلۂ فریاد
نکل پڑے مگر اوپر کا دم نہ ہو جائے
کہا یہ صدمۂ فرقت نے دیکھ کر دل کو
غریب کا یہ نیا ہی جہنم نہ ہو جائے
یہی ہیں کرم جو آہیں گناہ گاروں کی
دھواں دھواں یہی ابرِ کرم نہ ہو جائے

زمیں کو ہاتھ لگا کر تمہیں سلام کیا
یہ ہاتھ شاخِ سمن کا قلم نہ ہو جائے

ترے خیال کی ویران سی جو دل میں ہے راہ
شدہ شدہ یہی راہِ عدم نہ ہو جائے

اُٹھائی تیغ وہ انگڑائیوں نے اے ساقی
خمار بار نہ ڈالے ستم نہ ہو جائے

کہاں ہم اور کہاں المعی خدا کی یاد
تہی خدا سے یہ جب تک شکم نہ ہو جائے

۱۰ر رجب ۱۳۴۱ھ جمعہ

خیال اچھا

کسی کا سامنا ہو یا کہ پیچھا ایک حال اچھا
وہ بولے میرے آئینے سے تیرا ہی خیال اچھا

ٹھکانے لگ گیا دل لے لیا دزدیدہ نظروں نے
انہی چوروں کے گھر میں واہ یہ چوری کا مال اچھا

نہ دے بھر کر نہ دے مے اس قدر غصے اے ساقی
تہی ساغر ہی تیرے عکس رخ سے لال لال اچھا

وہی ہے ایک جو صد ہا مرادیں دے سکے میری
اُسی کے آگے پھیلانا ہے کچھ دست سوال اچھا

بہت سے مردہ دل تجھ کیوں نہ ڈالی جان ظالم نے
نہ سوجھا سامری کو ایک بھی سحر حلال اچھا

یہی میری تمنائیں کہ بر آنے نہ دو جن کو
تماہی سبزہ تو پاؤں میں تمہارے پائمال اچھا
کیا ہے میکدے کو فتح مئے خواروں کی فوجوں نے
اڑا دے اک پھریرا تو بھی اے باد شمال اچھا
نہ دیکھا داغ لگ جانے کو تھا یوسف کے دامن کو
نہیں رہتا ہے اے دل ہر جگہ حسن و جمال اچھا
قیامت کی ہی ہلچل ڈالدی اک باغ عالم میں
مناسب ہے کہ فتنہ بن کے اٹھا لے نونہال اچھا
نکوئی سے کہ اطمینان بھی ہو المعی جس پر
گنہ گاروں کا ہے اپنے گنہ پر انفعال اچھا

۲۰ رجب ۱۳۴۴ھ جمعہ

دزدیدہ نگاہی تیری

دل میں اک پھانس ہے دزدیدہ نگاہی تیری
برچھیاں کیا ہوئیں اے ترک سپاہی تیری

باغ پر تنگ دہانی کا بھرم کھل جاتا
لے گئے غنچوں نے دکھائی نہ جماہی تیری

مجھ کو تیار ملا میری محبت کا ثبوت
داغ تھا دل کا ہر اک مہر گواہی تیری

گو دکھائیں تری زلفیں ہی انھیں زندہ عشق
چل سکے راہ نہ ظلمات کے راہی تیری

وہ ادھر یک بیک آجائیں تو پھر اے شب ہجر
چاندنی بن کے نہ چمکے گی سیاہی تیری

قافلہ چھوڑ رہا ہے مگر اے منزل دوست
اب تو صورت سے ٹپکتی ہے تباہی تیری

میں تو دنیا میں دل خوں شدہ ہی سمجھا ہوں
جام مئے کہتی ہے کہ تباہ نگاہی تیری

داد دیتا ہوں بچھڑ کر تجھے اے سنگ لحد
جیتے جی میں نے تو چھائی نہ سراہی تیری

المعی اس کو گنہگار پہ رحم آئیگا
اک بلا ہے یہی ناکردہ گناہی تیری

۳ شعبان ۱۳۴۲ھ پنجشنبہ

دلا رکھتے ہیں

ہم تقاصد کو امید اُن کی دلا رکھتے ہیں
کوچ اُن قافلے والوں کو سُنا رکھتے ہیں
خاک اڑتی ہوئی دیکھے گا زمانہ اُن کی
سر میں جو تختِ سلیماں کی ہوا رکھتے ہیں
ڈوب کر ساغرِ لبریز میں پائیں گے بقا
ہم کہ عکسِ رُخِ ساقی میں فنا رکھتے ہیں
ایک دن دیکھ کوئی خون کا دھبہ اے ترک
تیرے دامن پہ شہیدانِ وفا رکھتے ہیں
بدنصیب ان میں کچھ آجاتی ہیں تھک جاتی ہیں دفن
دل کو ہم گور مرادوں کی بنا رکھتے ہیں

سرکش اچھے رہے نفرت سے انھیں چھوڑ دیا
سر جھکاتا ہوں تو گردن پہ جو ار کھتے ہیں

سینہ کوبی میں کبھی ساتھ جو دیتے تھے وہ ہاتھ
صبر کی سل مری چھاتی پہ اٹھا رکھتے ہیں

میں تو شوخی کو حسینوں کی یہی سمجھا ہوں
ایک سرمہ ہے کہ آنکھوں میں لگا رکھتے ہیں

بلبلے بن کے وہ دریا میں نظر آتے ہیں
ولولے دل میں جو ہم اپنے دبا رکھتے ہیں

کیا مزے دار ہیں عقبیٰ کے یہ ذکر اے واعظ
دور کے ڈھول سہانی ہی صدا رکھتے ہیں

حس کہاں رکھتے ہیں وہ اور کسی حاجت کا
جب کہ عشاق کو راضی بہ رضا رکھتے ہیں

دشمن اے المعیؔ تم پر نہ پسیجیں گے کبھی
دل یہ پتھر سے بھی سختی میں سوا رکھتے ہیں

۱۰ ار شعبان ۱۳۴۱ھ جمعہ

ہجراں کا

الٰہی سامنا ہے پھر شبِ تاریک ہجراں کا
دھواں بڑھتا نظر آتا ہے اک زلفِ پریشاں کا

عدم کہتے ہیں ان کی ناخوشی کی تیرگی کو ہم
یہ موجودات نظارہ ہیں رنگ روئے خنداں کا

تماشا ہو گیا وحشت میں اڑنا ریگ کا مجھ کو
سرِ افلاک لہرانے لگا دامن بیاباں کا

دلِ بیتاب کو ہم ڈھونڈھنے نکلے تو کیا پایا
کوئی ٹوٹا ہوا ٹکڑا کوئی اُکھڑا ہوا ٹانکا

جنوں میں ہاتھ بھی اُٹھنے لگا کب ناتوانی سے
گلے پر تھا برابر رات دن ناخن گریباں کا

کریں گی پرورش شرم وحیا ہی حسن کو اُن کے
یہی شعلہ تو بھڑکے گا چراغ زیر داماں کا

شب فرقت طلوع صبح کی وحشت نہ پوچھ اے دل
کسی نے قبر میں گویا مجھے منھ ڈال کر جھانکا

ہوا بھی تو ہوا یوں پار میرے منقبض دل سے
کہ شہپر نچ گیا تیر نگاہِ نازِ جاناں کا

تباہی کا ہجوم اور بیکسی کے جشن کیا دیکھوں
بپا ہے شامیانہ جس جگہ گورِ غریباں کا

رہے ہر حال میں خوش بادشاہی اس کو کہتے ہیں
نہ بن محتاج تو اے المعی عشرت کے ساماں کا

۱۰؍ شوال سنہ ۱۳۴۱ھ جمعہ

باتیں ہیں

ہمارے قتل پر آپس میں واں یاروں کی باتیں ہیں
یہ ابرو کے اشارے ہیں کہ تلواروں کی باتیں ہیں

مزہ دیتی ہیں سننے سے زیادہ کہنے والوں کو
نشے میں نقل کی جاتی جو میخواروں کی باتیں ہیں

بروزِ حشر بن جائیں گی جو سرمایہ بخشش کا
الٰہی کونسی تیرے گنہگاروں کی باتیں ہیں

نہ بچنے دو تو میں جانوں تڑپتے لوٹتے دل کو
نشانے پر نگہ رکھنا کمانداروں کی باتیں ہیں

دکھایا خواب نے تم کو بڑا احساں کیا — ورنہ
تمہیں آنکھوں سے میں دیکھوں یہ ہشیاروں کی باتیں ہیں

بچھونا ہمارے کانٹوں کا بچھونا ہو گیا مجھ کو
کھٹک جاتی ہیں ایسی میرے غمخواروں کی باتیں ہیں

کیا تھا قصد کس انٹی کی بڑھیا نے خریدی کا
کہاں یوسف ع کہاں قیمت یہ بازاروں کی باتیں ہیں

نئے ارماں نئی محفل نظر آئی مرے دل میں
غریبوں کی ملاقاتیں ہیں بیچاروں کی باتیں ہیں

یہ سب اپنے پرائے دوست دشمن بن گئے کیونکر
یہی اے المغنی برگشتہ سیاروں کی باتیں ہیں

۲۲ ہر شوال ۱۳۴۱ھ جمعہ

خوبرو کیا ہے

ملا نہ بھید کہ آخر وہ خوبرو کیا ہے
مجھی سے پوچھ رہا ہے بتا کہ تو، کیا ہے
حنا کا رنگ اُڑا دیں وُہ ہاتھ مل مل کر
دکھاؤں اُن کو مرا خونِ آرزو کیا ہے
جو سر پٹکنے لگے ہم شرر اٹھے پیہم
پسیجنے کو رگِ سنگ میں لہو کیا ہے
چلوں حضور میں۔ موجود ہے نماز کی شرط
ترے خیال کا آنا ہے اور وضو کیا ہے
مقابلے میں نہ غنچوں کے ہو رہو خاموش
تمہاری تنگ دہانی میں گفتگو کیا ہے

پھٹا ہوا ہی نہ کیوں رہنے دوں گریباں کو
جنوں کا یہ بھی تو دھبّا ہے اک رفو کیا ہے

الٰہی عشق و محبت کا کونسا ہے وہ گُل
بسی ہوئی ہے دماغوں میں جسکی بو کیا ہے

پہنچ کے دوست کی منزل پہ جھاڑ دوں اسکو
غبار ہے مرے چہرے کا آبرو کیا ہے

وہ آشنا ہے کہیں آ رہی ہے جس کی صدا
پلٹ کے دیکھ رہا ہوں ہر ایک سو کیا ہے

وہ مل گئے ہیں جینے کی اب ہوس نہ رہی
خدا کا فضل ہے اب المعی عدو کیا ہے

۲۰ ذی قعدہ ۱۳۴۳ھ جمعہ

———— ٭ ————

کیا ہوا

پرسان نہیں کوئی مرا بن ہیں تو کیا ہوا
اب ڈھونڈھتی ہے یادِ وطن ہیں تو کیا ہوا

تم میرے گھر میں آکے دکھا دو شبِ فراق
چاند آگیا کبھی جو گہن ہیں تو کیا ہوا

اب دور ہاتھ پاؤں نکالیں کی شوخیاں
پوشاک غلغلی ہے بدن ہیں تو کیا ہوا

اچھا ہوا کہ آج تم اخلاق سے ملے
فرق آگیا جبیں کی شکن ہیں تو کیا ہوا

جلتے دلوں کی جانتے ہوئے قراریاں
اک پاؤں پر ہے شمع لگن ہیں تو کیا ہوا

اک روز بادِ تندِ خزاں نوچ لے گی پر
بلبل نے گھر کیا ہے چمن میں تو کیا ہوا
دیکھو وہ زلف جبکہ گھسیٹے گی راہ میں
باندھا ہوا گلا ہے رسن میں تو کیا ہوا
یوسف بنا کے اس کو نکالیں گی حسرتیں
دل پڑ گیا ہے چاہِ ذقن میں تو کیا ہوا
بس ہے پتہ یہ ڈھونڈھنے والے کے واسطے
ہے احتمال اُن کے دہن میں تو کیا ہوا
دنیائے سرد مہر نے دل کر دیا ہے پست
گرمی ہے المعیؔ کے سخن میں تو کیا ہوا

۲۱ ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ جمعہ

تن بدن میں

پھیلیں گے داغ دل کے اے عشق تن بدن میں
آئے گا رفتہ رفتہ سکّہ ترا چلن میں
محفل میں آئے ہیں وہ جانا ہو جیسا رن میں
تیغیں چمک رہی ہیں ابرو کے بانکپن میں
اس زلف کی سیاہی چنگیز کی ہے شاہی
تاتار پر تباہی اندھیرے ختن میں
سُن سُن کے ذکر میرا اِترا رہے ہیں دشمن
افسوں بھرا ہے ظالم تیرے لبِ دہن میں
اب تک تو آنچ میں نے آنے نہ دی ہے دل پر
کولا سا جل رہا ہے شعلے کے پیراہن میں

پھولوں سے جب ہنسے ہیں آنسو ٹپک پڑے ہیں
رونے کے واسطے ہم آئے تھے اس چمن میں

نیچ اونچ کب جہاں کا ہے مصلحت سے خالی
اُبھرے ہی ڈوبتے ہیں دریائے موجزن میں

اشجار جھومتے ہیں اور بولتی ہے بلبل
آتے ہیں میرے نالے پچھلی سے جب بھجن میں

کرتی ہیں غربتیں بھی کیا انقلاب حالت
یوسفؑ کو بادشاہی ملتی کہاں وطن میں

بدلے گا اُن کا جلوہ خلقت ہی عاشقوں کی
اُڑتے دکھائی دیں گے پروانے انجمن میں

معنی میں کچھ تو جدت۔ الفاظ میں تو لذت
شاعر ہیں آج ہم بھی اے المعیؔ دکن میں

۳ ہر ذیحجہ سنہ ۱۳۴۲ھ جمعہ

بدگماں کی ہے

محفل میں مجھ پہ آنکھ ہر اک بدگماں کی ہے
باتوں میں سب جھلک مرے رازِ نہاں کی ہے

اک جامِ مئے نے ہوش کو رستہ بتا دیا
یہ روشنی ہدایتِ پیرِ مغاں کی ہے

صبح شبِ فراق کے ہونے کی کیا خوشی
اللہ! یہ تو گرد اسی کارواں کی ہے

ایک آسماں ہے آنکھ کے پردے کے ساتھ ساتھ
گردش تمہاری آنکھ میں ہفت آسماں کی ہے

پروانوں کو جلا کے ابھی چاٹتی ہے ہونٹ
وہ شمعِ جلوہ گاہ، چٹوری زباں کی ہے

مرنے کے بعد چین سے سونا جو ہو نصیب
اے المعی لحد نہیں آغوشِ ماں کی ہے

۳ محرم ۱۳۴۲ھ جمعہ

ہر ایک خو پسند

اچھی ہو کہ بُری تری ہر ایک خو پسند
میں کیا کہوں کہ کیوں مجھے آیا ہے تو پسند

عاشق بھی چاہتے ہیں یہ بے عزتی کی موت
ہے جب کہ ان کو جان کے ساتھ آبرو پسند

مقتل کو دم میں چھوڑ دیا جھاڑ پونچھ کر
آیا بہت ہوا کو ہمارا لہو پسند

رستے رضا کے اپنی بتا دے مجھے کریم
پھرتا ہی گر رہا ہے تجھے کو بکو پسند

طفلی میں لاکھ بار وہ بگڑے سنبھل گئے
آتی تھی ہم کو اُن کے بگڑنے کی خو پسند

فصلِ خزاں نے دی مجھے تنکوں کی سوئیاں
کرنے لگے ہیں چاکِ گریباں رفو، پسند

جب سے کہ دل کو ہے ترے ملنے کی آرزو
آئی نہ اور کوئی اسے آرزو پسند

اچھا ہے کافروں میں چھپا اپنے عشق کو
مٹی کی مورتیں ہی کر اسے حیلہ جُو، پسند

کیوں یاد ہیں وہ تم کو ہماری ضیا فتیں
آئی تھی اک جلی ہوئی بوٹی کی بو، پسند

شعلے کو رُخ، دھوئیں کو تمھاری سیاہ زلف
ہے شمعِ انجمن کو بیاضِ گلو، پسند

بولے وہ اپنے گوں کی کہی جب کبھی کہی
آئی نہ المعی کی ہمیں گفتگو پسند

۱۷ محرم ۱۳۴۲ پنجشنبہ

بہارِ بچپن

دکھلائیگا کچھ اپنی آ گے بہارِ بچپن
کس نازنیں قوی کا ہے سبزہ زارِ بچپن

شُہرے ہوں زلف و رُخ کے آئے شباب اُن کو
لائے جہاں میں ایسے لیل و نہارِ بچپن

تھم تھم کے ہم چلیں گے اور جا بجا گرینگے
پیری میں یاد آئے گا بار بارِ بچپن

سو سو تکلف اُن کی ایک ایک سادگی میں
کیسے شباب کا ہے امیدوارِ بچپن

بلبل سے بولتے تھے پھولوں سے کھیلتے تھے
ہے یاد تم کو اپنا اے گلعذارِ بچپن

گھوڑا بنے ہوئے ہیں سرپٹ وہ دوڑتے ہیں
ہوتا ہے کیا الٰہی کیا ہے بہار بچپن

بچپن کا تذکرہ ہے اے المعی یہ کیا ہے
کس عمر میں ہوا ہے سر پہ سوار بچپن

۲ر صفر ۱۳۳۲ھ جمع

دعا دیتی ہے

وقتِ مشکل کے بڑا کام دعا دیتی ہے
ہاتھ گرتی ہوئی ہمت کو لگا دیتی ہے
خوئے بد ہی تو حسینوں کے ہے بازار کا راز
حوصلے چاہنے والوں کے بڑھا دیتی ہے
اُن سے میری شبِ فرقت کے نہ سنّاٹے پوچھ
لوریاں دیتی ہے ایسی کہ سلا دیتی ہے
طاقت اک دن وہی کر دے گی قیامت برپا
اُن کی قامت کو جو یہ نشو و نما دیتی ہے
نیند میں جھومتے ہو جیسے کوئی شاخِ گلاب
تم کو جھونکے یہ فقط بادِ صبا دیتی ہے

دل سے اٹھتی ہے تو لب تک بھی اب آتی نہیں آہ
پیچ پر پیچ تری زلفِ رسا دیتی ہے

جل کے عشاق کو بجھنے نہیں دیتی الفت
راکھ ہی میں کبھی انگارے دبا دیتی ہے

شام تک صبح سے دیکھا مجھے گم گشتۂ راہ
بڑھ کے ویرانیٔ منزل ہی صدا دیتی ہے

ہل گیا بزم میں جس پر کہ پڑی اس کی نظر
جیسے اب ہاتھ پکڑ کر یہ اٹھا دیتی ہے

المعی دم کا دمامہ ہے جب آجاتی ہے موت
سارے جھگڑوں کو یہ دم بھر میں چکا دیتی ہے

۱۲ صفر ۱۳۴۲ھ جمعہ

کام کے اٹھے

شعلے اگر اُٹھے بھی تو کس کام کے اُٹھے
جب رخ سے دھوئیں زلف سیہ فام کے اُٹھے

آواز ترے حسن دل افروز نے جب دی
سرشار ہزاروں طمع خام کے اُٹھے

اس شوخ کی ہیبت نے کیا پیر جواں کو
فتنے بھی بہت تھم کے عصا تھام کے اُٹھے

جس وقت پڑے آنکھ پہ ساقی کے پڑے ہاتھ
ہر چند کے لینے کو بھرے جام کے اُٹھے

شام آتے ہی آہیں مری جاری ہوئیں اے دل
یہ قافلے جائیں گے کہاں شام کے اُٹھے

خورشید اسے خورشیدِ قیامت سے نہیں کم
جو بیٹھ کے سایے میں ترے بام کے اُٹھے

دنیا سے جو اُٹھے تو دعا ہے مری زاہد
دامن میں لپیٹ کر مرے احرام کے اُٹھے

ہر یاس کو سمجھا کیے مقصود کی سیڑھی
ہم تھے کہ سہارے دلِ ناکام کے اُٹھے

آتے ہی شبِ ہجر کے تاروں کی کھلی آنکھ
لو دیکھنے والے مرے انجام کے اُٹھے

اے المعی دیکھی جو رباعی کی یہاں قدر
ہم خاک نشیں بھی درِ خیّام کے اُٹھے

غرہ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ جمعہ

کیا جانے

تصور کی ترے عاشق کے استعداد کیا جانے
اُتر جاتی ہے صورت کس جگہ بہزاد کیا جانے

یہاں تشبیہ میں باندھا گیا اُس کے قدِ رعنا کی
کہا پھر کس نے یارب سرو کو آزاد کیا جانے

ہوئے دنیا میں کیا کیا حادثے اس کے مٹانے کو
پڑی تھی کس گھڑی انسان کی بنیاد کیا جانے

یہی اپنے مصائب کا تحمل جان لے ورنہ
خوشی کیا چیز ہے تو اے دلِ ناشاد کیا جانے

محلّے میں جہاں دروازہ دیکھا جا کے دستک دی
یہی بابِ اجابت ہے مری فریاد کیا جانے

فقط دیکھا ہے میں نے کھول کر اکبار آنکھ اُس کو
شراب عشق کا وہ جرعۂ معتاد کیا جانے
کئی رخنے نکالے المعی زہد و ریاضت نے
کوئی اس خرقۂ سالوس کی ایجاد کیا جانے

۲۸ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ جمعہ

نہیں ہے

آہوں کا وہ اب دھواں نہیں ہے
سر پر مرے آسماں نہیں ہے
سچ کر کے دکھاؤں اپنا مرنا
اب جب کہ وہ بدگماں نہیں ہے
ناصح کی نہ سن نصیحت۔ اس کو
دردِ دلِ عاشقاں نہیں ہے
آ۔ اے شبِ ہجر! لوٹ لے آ
کچھ مرے سوا یہاں نہیں ہے
مردہ ہے ہمارے شیخ کا نفس
توسن کوئی زیرِ راں نہیں ہے

آہستہ ہوا میں اس پہ ظاہر
نازک ہے وہ ناتواں نہیں ہے
بلبل ہی کے ساتھ بول اُٹھتا
کانٹے کو بھی کیا زباں نہیں ہے
یاد آنے لگی قفس کی انست
دیکھا کہ وہ آشیاں نہیں ہے
باتیں تری بے مزہ ہیں واعظ
بیتی ہوئی داستاں نہیں ہے
ہاں پیس دے المعی کو اے چرخ
یہ پوست و استخواں نہیں ہے

۱۲ر جمادی الاول ۱۳۳۲ھ جمعہ

یار میں ہے

کچھ اور زیست کا پہلو بھی ہجرِ یار میں ہے
قرار دل میں الٰہی نہ دل قرار میں ہے

پسند ان کو مرا ایک دل ہزار میں ہے
جگہ اسی کی تو اس چشمِ اعتبار میں ہے

قدم قدم سے یہ ظاہر خرامِ یار میں ہے
مزار ہے کوئی بیکس ہی اس مزار میں ہے

ڈرے اٹھائے ندامت مگر نہ ہو مایوس
بڑا کمال تمہارے گناہ گار میں ہے

کھڑے کیے ہیں وہ فتنے تمہاری قامت نے
شمار میں نہ قیامت میں کس قطار میں ہے

سیاہی پھیل رہی ہے افق سے راہ میں ہوں
اب آخری مری منزل اسی غبار میں ہے

نہیں ہے تیری ریاضت میں ذائقہ زاہد
جو ایک جرعہ مئے ناب خوشگوار میں ہے

پروکے کوئی دکھایا کرے گہر کب تک
مگر یہ بات مری آنسوؤں کے تار میں ہے

عجیب یاس سے میں تک رہا ہوں تیری راہ
کہا ہر اک نے یہ مرنے کے انتظار میں ہے

خدا کے واسطے یہ پھانس کھینچ ڈال اے نزع
ذرا سی جان یہ اب تک بھی جسم زار میں ہے

طریق عشق میں معشوق کار ہے عاشق
نہ المعی کہ فقط دل کے اختیار میں ہے

۲۶ جمادی الاول ۱۳۴۲ھ جمعہ

مرجاتے تو مرجاتے

انھیں کے دھیان میں اکبار مرجاتے تو مرجاتے
اگر ہم جان سے جاتے تو سیدھے اپنے گھر جاتے

نہ چھپتی بات محفل میں جو اُن کو دیکھ لیتا ہوں
رقیبوں کو مری آنکھوں سے تنو تار نظر جاتے

نہیں آگاہ تو عشاق کی فطرت سے اے ناصح
نہ آتا آپ ہی دل تو کسی کی بات پر جاتے

دکھا دیتے جوانی کا سلیقہ بھی ترے کاکل
جو بگڑے تھے تو بنجاتے تو بکھرے تھے سنور جاتے

وہ شوخ آنکھیں مرے ارمان دل کو دیکھ تو لیتیں
غزالان حرم ہی آکے اس سبزے کو چر جاتے

مرقع اک عجب عبرت کا بن جاتا ہی عالم
امیدیں ٹوٹ جاتیں تم سے جب چہرے اُتر جاتے

ازل سے ہم ہیں پروانے تری شمع توحید کے
جدھر اپنی ضیا یہ ڈالتی اُڑکر اُدھر جاتے

تمھارے غائبانہ کب مجھے عالم میں کچھ سوجھا
اندھیرا گھپ اگر تم دیکھتے ایسا تو ڈر جاتے

بچانے کی اِدھر کوشش اُدھر دامن پہ گلکاری
مزہ ہوتا لہو میں ہاتھ بھی ظالم کے بھر جاتے

گئے اور جانے والے تھے کسی کو یاد بھی آتے
اگر تم المعی ایک آدھ اچھا کام کر جاتے

۱۱ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ جمعہ

شب کا

آپ اپنے کو بھولا ہوا بیٹھا تھا میں کب کا
اس رُخ نے دکھایا مجھے آئینہ حلب کا

میخواروں پہ ہوتی ہے مئے ناب کی بارش
یا دل جو گرجتا ہے مرے شور و شغب کا

اُس بزم میں ساقی نے لیا لب کیے کا سے
قسمت سے جہاں جرم ہلانا بھی ہے لب کا

تم آتے ہی میدانِ قیامت ہوا سنسان
تھا کونسا اٹھتا ہوا فتنہ کہ نہ دبکا

ہو جائے مرا دل تری ہر شان کے قابل
یہ پیرو کامل ترے ڈالے ہوئے ڈھب کا

اتنی بھی کہاں آہ کہ دے عرش کو جنبش
سینچا مری آنکھوں نے تو پودہ بھی یہ بھپکا

مئے پی کے وہ میخانے سے برسات میں اُٹھے
جو دیکھنے والا ہے یہاں رحمتِ رب کا

جینے کا سہارا ہے سحر تک تری امید
یہ صبح کا تارا ہے مرے ہجر کی شب کا

اے المعیؔ اخلاق ہے بنیاد نسب کی
بیکار ہے بد اخلاق کو غرّا ہے نسب کا

۹ رجب ۱۳۴۲ھ جمعہ

مشکل میں ہے

ذائقہ نعمت کا تیری دی ہوئی مشکل میں ہے
اس گرہ کو دانت ہی سے کھولنے کی دل میں ہے

ہر جگہ پاتا ہوں اس کو وہ جو میرے دل میں ہے
قیس سے پوچھو کہ لیلیٰ کونسی محمل میں ہے

میں ہوں یا اغیار ہیں یا شمع جو محفل میں ہے
صورتیں ہیں اس تلوّن کی جو میرے دل میں ہے

میان سے اس نے لیا خنجر مگر سمجھے یہ ہم
آج قاتل کی زباں بھی قبضۂ قاتل میں ہے

قافلے کتنے تڑپ کر جائے گی منھ کھول کر
یہ اُداسی جو مری چھوڑی ہوئی منزل میں ہے

وہ بہت سر پر کھڑے جھوما کیے بادل کی طرح
آنکھ سے دیکھا کہ بجلی کی تڑپ بسمل میں ہے

جب کہی اچھی کہی ناصح نے لیکن بے محل
المعی اک بات اس حیوانِ لایعقل میں ہے

۲۳ رجب ۱۳۴۲ھ جمعہ

آرام کو

بزمِ عشرت میں بھی میں ترسا کروں آرام کو
ساتھ رکھ اے آسماں گردش میں میرے جام کو

چونک کر رہ جاتے ہیں مستوں کی صورت نوجواں
سنتے ہیں ناصح سے جب اک بانگِ بے ہنگام کو

سہل آسکتی تھی۔ رندوں کو ندامت آگئی
جانتا ہے کون یارب رند کے انجام کو

آپ کے جلوے کے نیچے بیٹھ جاتا کیا مجال
اُٹھ کے عاشق کی نگاہیں تھام دیتیں بام کو

سبز پتوں میں کہونگا میں کہ اک پھول آگیا
تم چھپا لو دونوں ہاتھوں سے رخِ گلفام کو

تیز اٹھتے ہیں قدم رہرو کے پستی کی طرف
یہ ترقی کیا کرے گی مغربی اقوام کو

جان اک عالم کی سب مٹھی میں کھنچ کر آگئی
یوں دبوچا یاس نے میرے دلِ ناکام کو

بھر رہے ہیں آنکھ میں فرقت کے صدمے صبح سے
میں نے منڈلاتے ہوئے دیکھا ہے سر پر شام کو

چھوٹ جائے گا نکوکاری کی شہرت کا اثر
مئے سے دھو ڈالو ہمارے جامۂ احرام کو

باغ کو اغیار کی محفل سے بدتر کر دیا
دوڑ کر لپٹی صبا اُس سرو سیم اندام کو

کامیابی تھی کیسے جاتے جو ایسے کام بھی
بوالہوس اے المعی مرتے ہیں جیسے نام کو

۲۱ر شعبان ۱۳۴۲ھ جمعہ

شاد کروں

دل کو ہر وقت تری یاد سے میں شاد کروں
اس طرح مجھ کو جدا کر کہ بہت یاد کروں

عشق میں کام نہ دیگا یہ دھڑکتا ہوا دل
چلنے والی کوئی اچھی سی کل ایجاد کروں

میری تدبیر نے منہ دیکھ کے ہنس کر یہ کہا
اس گرفتارِ مقدّر کو میں آزاد کروں

چھت میں افلاک کی زنجیر لگا دوں اے دل
منہ اٹھا کر کبھی پچھلی سے جو فریاد کروں

کہتے ہیں حسن کے بازار کا سکّہ تجھ کو
پاس رکھ کر تجھے کیا اے دلِ ناشاد کروں

میرے ارمان بھرے دل سے چلا اُن کا خیال
اور آ گئے کسی ویرانے کو آباد کروں

آہیں بھر بھر کے ارادہ ہے کروں دل خالی
کھو کھلی گنبد خضرا کی نہ بنیاد کروں

میری ہستی کو رقیبوں کی نہ سمجھو محفل
آپ کی نذر یہ مجموعۂ اضداد کروں

المعی کل تو ہے پکڑے ہوئے جانا مجھ کو
آج کیوں منھ نہ سوئے خانۂ صیاد کروں

۲ر شوال ۱۳۴۲ھ جمعہ

دھڑکا مرے دل کا

کریگا فاش دل کے راز سب دھڑکا مرے دل کا
کہ اک اُڑتا ہوا پردہ ہے یہ لیلیٰ کی محمل کا

اٹھائی جس طرح راحت کبھی اب رنج سہتا ہوں
وہی گیلی گندھی مٹی ہے راز اس طبع قابل کا

شراب تلخ اگر ہے اصل ہی دنیا میں عشرت کی
پلا دے جام ساقی آج ہی زہر ہلاہل کا

خدا جانے کہ طے کرتا ہوں کیسے کالے کوسوں کو
نگل جاتا ہے اژدر بن کے رستہ مجھ کو منزل کا

نہ اتنا حرص میں پھنستا نہ ہوتی اتنی مایوسی
یہی انبار ہے اے دل تری محنت کے حاصل کا

بتاؤں کیا گت ارمانوں کی ہیں جب تم نے غفلت کی
سنا ہوگا کبھی محفل میں بجھنا شمع محفل کا

ہزاروں مار لہرانے لگے صحرائے وحشت میں
قیامت ہوگیا جھنکارنا میری سلاسل کا

بھلا یہ اور ورطوں سے ہلاکت کے نکل آتی
طمانچے پر طمانچہ تھا مری کشتی پہ ساحل کا

وہ آنکھیں بھی کہ شاہوں کی طرف مشکل سے اٹھتی ہیں
وہاں جاتے ہی بنجاتی ہیں کاسہ دستِ سائل کا

مہم کون و مکاں کی دیکھ لو دم بھر میں سر ہوگی
نکل آتا ہے اپنی میان سے بس تیغِ قاتل کا

اسی کو کہتے ہیں اے المعی انساں کی مجبوری
یہی سینے پہ دھر لینا ہے آساں صبر کی سل کا

۱۶ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ جمعہ

دیکھ رہے ہیں

محفل میں وہ بچ بچ کے ادھر دیکھ رہے ہیں
انجان ہم انداز نظر دیکھ رہے ہیں
اک تازہ گرفتار کی عادت کا تماشا
وہ باندھ کے پرواز کے پر دیکھ رہے ہیں
وحشت میں ہماری در و دیوار پہ ہے آنکھ
جیسے کوئی بھولا ہوا گھر دیکھ رہے ہیں
دولت نہ سمجھتے وہ بھلا کم سخنی کو
غنچوں کی بھی مٹھی میں تو زر دیکھ رہے ہیں
ہم خوش ہیں کہ خالی نہ گئیں تم کو کیا سخت
اتنا تو دعاؤں کا اثر دیکھ رہے ہیں

اب تک تو زیادہ نہیں فق منھ سے ہمارے
کیا رنگ بدلتی ہے سحر دیکھ رہے ہیں

حلّت کی یہ تھی شکل کہ ہم دخترِ رز کو
زاہد سے بہت شیر و شکر دیکھ رہے ہیں

اعمال نے مرنا نہ ہمیں یاد دلایا
باندھا ہوا سامان سفر دیکھ رہے ہیں

یکتائی کی تنہائی سے وحشت ہوئی اُن کو
آئینہ وہ اب آٹھ پہر دیکھ رہے ہیں

کس چیز میں اے الفتی خوبی نہیں کوئی
ہر شاخ پہ ہم اک گلِ تر دیکھ رہے ہیں

۲۹ ذیحجہ ۱۳۳۲ھ جمعہ

آئی نہ گئی

زندگی کیا ہے سمجھ میں مری آئی نہ گئی
اس بدن میں بھی حقیقت کوئی پائی نہ گئی

کس کے آگے ہوئی کس بزم میں روشن اے شمع
تیری قسمت میں تھی انگشت نمائی نہ گئی

اُن کی دُشنام کا احساس ہوا کب مجھ کو
چیز کھانے کی نہیں تھی کوئی، کھائی نہ گئی

فکرِ دنیا مری فطرت کو بدلتی کیوں کر
گرد سے آئینے کے دل کی صفائی نہ گئی

دیکھتے دیکھتے پیدا ہوئی اُنسیت اُن کو
خالی اُس در پہ مری ناصیہ سائی نہ گئی

مئے سے رندوں کی مذمّت میں پڑے ہیں واعظ
آگ پانی میں شریروں سے لگائی نہ گئی

ایک دن کھا کے رہیگا مجھے تو اے غمِ یار
اندر اندر وہ تری کارروائی نہ گئی

صورت آہن کی بدلنا کوئی دشوار نہ تھا
بات سچّی مرے دشمن سے بنائی نہ گئی

دل میں رہ جائے گی اے المعی تنویر کی یاد
ساتھ تنویر کے مٹّی میں چھپائی نہ گئی

۱۰ شعبان ۱۳۴۳ھ جمعہ

ثانی مجھے

وہ تو کیا میرا نظر آئے نہ واں ثانی مجھے
آئینہ ایسا دکھائے اب کے حیرانی مجھے

کچھ نہ عاشق کی پریشانی کی پوچھو لذتیں
آپ کی زلفِ پریشاں ہے پریشانی مجھے

جان لوگے اس کی سب رونق تھی میرے دم کے ساتھ
دور تک چھوڑے گی اس منزل کی ویرانی مجھے

کھینچتے تھے بے غرض عالم کے دل اپنی طرف
یاد ہے وہ آپ کا بچپن، وہ نادانی مجھے

اُس نے پرتو مجھ پہ جب ڈالا نظر آنے لگا
غیر اک ظلمت کا پتلا پیکرِ فانی مجھے

میں تو غافل تھا خدا سے پر افق نے صبح کو
خاک پر رکھ کر دکھائی اپنی پیشانی مجھے

نشۂ مے تیری اک ادنیٰ توجہ ساقیا
ہاتھ سے اپنے عطا کر گھونٹ بھر پانی مجھے

غیر تک جاتے ہوئے پکڑا گیا اُن کا خیال
مل گئی جس دن دلِ نازک کی دربانی مجھے

المعی - ہر یا گئیں شاخیں میں تنکا رہ گیا
ساتھ ہم جنسوں کے لازم تھی پر افشانی مجھے

۱۷ شعبان ۱۳۷۳ھ جمعہ

دیکھ لیا

واں جو پہنچا کبھی پیش اور کبھی پس دیکھ لیا
دیکھنے کی انھیں تنہا تھی ہوس دیکھ لیا

جیا بچا آگے ہی آگے نظر آئی منزل
ڈال کر عشق کے رستے میں فرس دیکھ لیا

زرد چہرہ مرا تم دیکھ کے سمجھے عاشق
یوں لگا دی مری قیمت ہر اکس دیکھ لیا

[illegible] ! ہائے اسی شاخ پہ جس روز تھے ہم
گوشے گوشے میں گلستاں کے قفس دیکھ لیا

چین کے دکھلاؤں چھلکتی ہوئی مئے بھی زاہد
خانقاہ میں تو تجھے بے حس و مس دیکھ لیا

ساتھ کانوں کے زباں چاٹتے رہجائینگی ہونٹ
ان کی باتوں سے ٹپکتا ہوا رس دیکھ لیا

یہ کہاں محفلِ ہستی کا جما سکتا رنگ
چھیڑ کر میں نے بہت تارِ نفس دیکھ لیا

طے ہوئی راہِ شبِ ہجر پڑا خطِ سحر
دور سے گنبدِ خضرا کا کلس دیکھ لیا

المعی فصلِ خزاں یاد دلائے گی بہت
ہم نے جو موسمِ گل اب کے برس دیکھ لیا

۲۴ شعبان ۱۳۴۳ھ جمعہ

تصویر ہو گیا

ہر طرف بانکپن کی وہ تصویر ہو گیا
مرزا بنا کبھی تو کبھی میر ہو گیا

ضایع گئی جہاں میں جو تدبیر تھی مری
جو کچھ کہا انھوں نے وہ تقدیر ہو گیا

بے حس دلوں میں عشق کی پیدا ہوئی جلن
آیا جو اُن کی بزم میں تسخیر ہو گیا

سمجھے انھیں شباب کی غفلت سے جاگ کر
یوسف ہمارے خواب کی تعبیر ہو گیا

اُڑ اُڑ کے ہائے خاک ہماری لپٹ گئی
دامن کسی کا نسخۂ اکسیر ہو گیا

دشمن کے دل میں تھا کوئی حسرت بھرا خیال
لیکن وہی قضا کا مجھے تیر ہو گیا

چھنتا رہا فراق کی چھلنی سے دیر تک
نورِ سحر سفوفِ تباشیر ہو گیا

اے چشمِ مستِ یار دکھا اپنی گردشیں
دیکھوں کہ میکدہ کہیں تعمیر ہو گیا

میں چل سکا نہ ضعف سے بل کھا کے رہ گئے
اک پاؤں ایک پاؤں کی زنجیر ہو گیا

کل تک کسی کو کون ہے کیا ہے خبر نہ تھی
آج المعی شریکِ مشاہیر ہو گیا

۵ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ جمعہ

دربانوں کے

لالے پڑ جائیں گے جاتے ہی وہاں جانوں کے
حوصلے دور سے بڑھ جاتے ہیں نادانوں کے

فاش کرتے ہیں تلوّن کو تری شانوں کے
یہ بدلتے ہوئے پہرے جو ہیں دربانوں کے

تم نے دیکھی نہیں شاید کوئی وحشت زدہ آنکھ
رقبے گر جائیں گے آنکھوں سے بیابانوں کے

ہو مرے بعد بھی گردش کا زمانے کی گذر
شہر آباد ہوں یارب مرے ویرانوں کے

تو نے کس کس کی یہاں دل شکنی کی ساقی
مرے ٹوٹے ہوئے ساغر بھی ہیں پیمانوں کے

آج عشاق میں دیکھا ترا غصّہ قاتل
شمعِ سوزاں پہ ہجوم آج تھے پروانوں کے

جھک گئے باغ میں بادِ سحری کی جانب
پھول کچھ نظر آتے ہیں بہت کانوں کے

ہو رہا جانیے کس چاہِ ذقن کا مرا دل
قافلے مصر کو راہی ہوئے ارمانوں کے

کی خطا دیر میں نا اہل نے صورت پائی
ورنہ پتھر بھی ہیں کعبے میں مسلمانوں کے

پیچھے پیچھے ترے پتھر رہیں تا دشت اے طفل
اور ہیں غول سے آگے ترے دیوانوں کے

المعی بات تو ہوتی ہے یگانوں کی شاق
ورنہ صدمے بہت آسان ہیں بیگانوں کے

۱۹ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ جمعہ

کام ہے

ہم کو تو جس سے کام نکلتے ہیں کام ہے
منھ کی بجائے شیخ ہی سمجھیں کہ نام ہے

وہ کب سے چشم شوق میں محو خرام ہے
اللہ! یاں سے دل بھی تو دو چار گام ہے

زاہد سے بڑھ کے حرمت مے کا ہوں معترف
میخانہ آج کل مجھے بیت الحرام ہے

وحشت کا زور و شور ہواؤں کی سائیں سائیں
موسم بدل رہا ہے بڑی دھوم دھام ہے

صورت عزہ نے خوب دی اس چشم مست کو
ساقی کے دونوں ہاتھوں میں لبریز جام ہے

ہر وقت کر سکا میں ہر اک رنگ کو تمیز
اُس شوخ کے مزاج میں کتنا قیام ہے

آج آفتابِ حُسن ہے نصف النہار پر
سایہ اُسی طرح سے ابھی زیرِ بام ہے

کہتے ہیں وہ کہ چھوڑ کے آ شوقِ دید کو
آنکھیں جھکا لے دل میں اگر احترام ہے

پھیرا جدھر کو زلفِ پریشاں نے پھر گیا
ایسا مرا سمندِ ہوس خوش لگام ہے

مقصودِ زندگی کا یہی تھا اک المعی
اُن کی نگاہِ لطف قضا کا پیام ہے

۲۵ ذیقعدہ ۱۳۲۳ پنجشنبہ

لشکر کے ہو گئے

پہلے روانہ صبح سے ہم ڈر کے ہو گئے
پیچھے شبِ سیاہ کے لشکر کے ہو گئے

زاہد کو میکدے میں نشاد خترِ رز کے ساتھ
اچھا ہوا غریب بھی یہ گھر کے ہو گئے

لینے لگے اُپج کی چمن میں خدا کی شان
گلبن تمھارے قد کے برابر کے ہو گئے

اک روشنی میں شمع کی تھنے غیر تھا ہی کون
اُس بزم میں سب ایک ہی نمبر کے ہو گئے

ہونے کو ہیں دلاترے برسوں کے راز فاش
پردے پرانے کعبے کے اندر کے ہو گئے

تھی کس کو ارتقا کی خبر حسنِ خلق تک
پہلے تو وہ خیال ہیں زیور کے ہو گئے
اک کام ہاتھ سے جو ہوا پنج بھی پڑ گئی
جس در پہ رکھ دیا سر اُسی در کے ہو گئے
دیکھیں شرابِ سُرخ میں پھولوں کی پتیاں
ٹکڑے جو ٹوٹ کر مرے ساغر کے ہو گئے
باتیں جو اضطرار کے پہلے کی تھیں وہ آج
قابو میں المعیؔ دلِ مضطر کے ہو گئے

۳ ذیحجہ ۱۳۴۳ھ جمعہ

کھینچی ہے

یہ تکلیفِ شریعت شیخ دیں ہاتھوں سے کھینچی ہے
پکڑ کر آپ نے حبل المتیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

تمھارے سامنے پاؤں تلے سے اس طرح سر کی
تمھیں نے جیسے میداں کی زمیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

نکلتی کیا کہ دل میں گڑ چکی تھی خار ہی بن کر
کسی کی آرزو میں نے انھیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

مریضِ عشق کی یہ سخت جانی دیکھ سکتے تم
اک آہِ سرد وقتِ واپسیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

اُتارا شمع سے فانوس کو میں نے سرِ محفل
وہ کہتے ہیں کہ میری آستیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

کریگا یونہی بے تلوار کھینچے خون بھی میرا
شرابِ سرخ تو نے اے حسین ہاتھوں سے کھینچی ہے

مری مٹی سے وہ کھیلا کیے اے المعی اکثر
کہیں ٹھوکر لگائی ہے کہیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

۲۸ ذیحجہ ۱۳۳۳ھ سہ شنبہ

شناسائی کا

حوصلہ غیر کو ہو خاک شناسائی کا
کیا بھیانک ہے یہ عالم مری تنہائی کا
دل سے یوسف کی طرح تیرا نکل جائے خیال
میں تو قائل نہیں اس چاہ کی گہرائی کا
قصے عاشق کی زبانوں پہ ہوں معشوق کے ساتھ
لطف ہے عشق کے بازار میں رسوائی کا
ناز جس طرح کہ پھبتا ہے پھبے تم کو نیاز
جامہ دکھلاؤ بدل کر کوئی زیبائی کا
بے دھڑک صحبتِ زاہد میں جھکایا سر کو
میں تو عادی ہوں کسی در پہ جبیں سائی کا

میں تجھے اور مرا منہ دیکھ رہا ہے عالم
اک تماشا ہے یہاں تیرے تماشائی کا

سرخ چہرے پہ مہِ چار دہم بن جائے
پڑنے دو نشہ میں ہالہ بھی اک انگڑائی کا

المعی سرد تھی دنیا کی ہوا پڑگئی اوس
دھوگیا داغ جگر لالۂ صحرائی کا

۱۴ صفر سنہ ۱۳۴۳ھ جمعہ

دل مرا ہوا

خالی ہر اک خیال سے کب دل مرا ہوا
اک وقت تم اگر نہ ہوئے دوسرا ہوا
میرا کمال بعد ہی میری قضا ہوا
غائب ہوا ہوں تجھ کو فقط دیکھتا ہوا
محشر میں بھی وہ آئیں سنور کر خدا کرے
رہ جائے ہاتھ میرے لہو میں رنگا ہوا
تو تو گزر چکی مرے سر پر شبِ فراق
پتلا ہے تیرے وہم کا ہر دم کھڑا ہوا
دیکھو پہنچ کے عرش پہ حاصل کیا اثر
ہے سر میں میری آہ کے طرّہ لگا ہوا

کیوں نازنیں لبوں کو مئے تلخ چھو گئی
غنچے سے بھی زیادہ ہے کچھ منھ بنا ہوا

ہنسنے دو دشمنوں کو یہاں میں ہوں مطمئن
دیکھا ہے کوئی پھول ہمیشہ کھلا ہوا

کی میکشوں پہ جام نے بھی لال لال آنکھ
شیشہ بھی بزم میں نظر آیا بھرا ہوا

دی ہم کو بندگی نے فقط زینت المعی
اک ہار ہے ہمارے گلے میں پڑا ہوا

۲۷ صفر سنہ ۱۳۴۴ھ پنجشنبہ

کہاں کی آواز

ہے لطافت میں وہ آواز، کہاں کی آواز
بوئے خوش ہے کوئی اس غنچہ دہاں کی آواز

تیر اک آدھ اگر بچ کے نکل جاتا ہے
صاعقہ ہم پہ گراتی ہے کماں کی آواز

جا کے چھا جاتی ہے محفل میں انھیں پر یارب
اُن کا آنچل ہے مرے مرثیہ خواں کی آواز

ڈر کے رہ نوک پہ جھنڈے کے چڑھا دیتی ہے
سر اٹھاتی ہے جب اپنا سے زباں کی آواز

مرنے والے کو دو عالم سے جو کر دیتی ہے مست
میٹھی میٹھی ہے وہ تارِ رگِ جاں کی آواز

پنبہ جس نے کہ اڑایا ہے افق پر شبِ ہجر
تھی وہ پہلی مری فریاد و فغاں کی آواز

مردہ تھا یاں سے وہاں تک یہی دریائے وجود
لائی حرکت میں اسے اک ترے ہاں کی آواز

متصل تند کئی گھونٹ پلا دیتی ہے
رعشہ دار ایک مرے پیرِ مغاں کی آواز

توڑ ڈالے گی شبِ ہجر کے سناٹے کو
دندناتی ہوئی آئے گی اذاں کی آواز

المعی حضرتِ شمسی نے بنایا تم کو
کان میں ہے سب اُسی اک ہمہ داں کی آواز

۲۸ صفر ۱۳۴۳ھ جمعہ

اُجالا نہ جائیگا

آنکھوں سے معرفت کا اُجالا نہ جائیگا
بے راہ تجھ کو جاننے والا نہ جائیگا

پہنچی ہے جیسے آہ رسا اُن کے کان تک
لہرا کے یوں چراغ پہ کالا نہ جائیگا

دنیا میں کچھ ریا کو زیادہ نہیں عروج
دوش اور سر سے آگے دوشالا نہ جائیگا

مرکز کو چھوڑ دیگی زمیں کانپ کر
رندوں کی لغزشوں کو سنبھالا نہ جائیگا

اک مضطرب نگاہ بھی اٹھیگی کم سے کم
صرف آسمان پہ مرا نالہ نہ جائیگا

صورت کو تیری آنکھ سے ہیں دل میں دوں جگہ
یوسف کنویں میں ہاتھ سے ڈالا نہ جائیگا

مغرب میں آفتاب پہ جھپٹی شب فراق
بولی یہ میرے منہہ کا نوالا نہ جائیگا

آہٹ پہ اس کی ہاتھ بھر اچھلا ہے دل مرا
ہاتھوں سے جس حسیں کے اُچھالا نہ جائیگا

ہم رند برشگال میں خالی کریں گے خُم
ساقی کے حوصلے کو کھنگالا نہ جائیگا

اغیار جا کے آئے ہیں سو بار المعی
میرا ہی واں خیال نرالا نہ جائے گا

۱۳ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ جمعہ

رُخِ بے نقاب پر

زلف اُڑ چلی ہے اُن کے رخِ بے نقاب پر
سایہ دکھائی دینے لگا آفتاب پر

دریا بنی ہوئی ہے مری بے قراریاں
تنکا سا بہہ رہا ہوں پڑا موجِ آب پر

واعظ میں اس کو چھوڑ کے بڑھتا تو دیکھتا
پڑتی مری نگاہ ثواب و عذاب پر

کیا عکسِ غیر مجھ سے پسِ پردہ ہو گیا
کیوں آئی تیرگی رخِ آئینہ تاب پر

میداں میں آئے وہ تو ہوئی ابتدائے حشر
بوسہ دیا رکاب نے اُٹھ کر رکاب پر

آنکھوں سے آج یہ دلِ صد پارہ گر گیا
ایمان لاؤ میری منزّل کتاب پر

نغموں کو ان کی محفلِ نازک کا ہے لحاظ
چیونٹی کی چال چلتے ہیں تارِ رباب پر

کیا سر پہ ابر جھوم کے آیا ہے ساقیا
قدرت مصر ہے آج مرے انتخاب پر

لے جائیگا خیال اڑا کر کہاں کہاں
کاٹو تو ایک رات مرے فرشِ خواب پر

سر پھوڑ لینے مستعد آئے تھے **المعی**
سر رکھ دیا مگر تری اونچی جناب پر

۱۱ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ جمعہ

کون سے دن

تیغ تھی وادئ وحشت کی ہوا کون سے دن
یوں نظر آئے تھے ہم بے سر و پا کون سے دن

کیا کہوں کس کی جوانی کی طرف جھک گئے شیخ
گر گیا ہاتھ سے حضرت کے عصا کون سے دن

ان کو سورج جو بنائے ہوئے تھا شوقِ ظہور
یہ شفق سر پہ ہمارے نہ رہا کون سے دن

جانے کب سبزۂ خوابیدہ کو بیدار کیا
باغ میں آئے دبے پاؤں صبا کون سے دن

ہے یہ پچھلی سے فلک پر مری پہنچی ہوئی آہ
زلف تھی صبح کے چہرے پہ بھلا کون سے دن

محفلِ روزِ ازل یاد دلادوں اے دل
ان میں پیدا ہوے یہ نازوادا کون سے دن

پھول تک کو بھی مرے غم نے نئی خلقت دی
خار آنکھوں میں کھٹک کر نہ بنا کون سے دن

گھونٹ بھر مئے کو بھی منبر پہ نہ چھوڑا میری
بڑھ کے پکڑے گی یہ واعظ کا گلا کون سے دن

المعی چورِ نشہ میں جو پڑا ہے سرِ خاک
گڑگڑاہٹ سے چمک کر نہ اٹھا کون سے دن

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ جمعہ

کون ہے

مجھ سے نہ پوچھیے کہ مرے دل میں کون ہے؟
آئینہ دیکھیے کہ مقابل میں کون ہے؟

چھیڑا ہے اُس نے چھپ کے مرے اضطراب کو
ناقے سے پوچھتا ہے کہ محمل میں کون ہے؟

جس کی کہ یہ چمکتی ہوئی تیغ ہے نقاب
غمزہ ہے یا ادا کفِ قاتل میں کون ہے؟

جھوٹا ہی اُن کا وعدہ ہو اُن کے سوا دخیل
میری طبیعتِ متحمّل میں کون ہے؟

ہر دَور نے لپیٹ دیا اک بساط کو
ساقی بچا ہوا تری محفل میں کون ہے؟

آئے وہ بحر پر تو انھیں فکر پڑ گئی
اک مضطرب یہ دامنِ ساحل میں کون ہے؟
کالک زحل کی چاٹ گئی تھی شبِ فراق
دیکھو اب آفتاب کی منزل میں کون ہے؟
زلفوں نے اُن کی باندھ لیا کیوں رقیب کو
اُلجھا ہوا کسی کی سلاسل میں کون ہے؟
راحت کے کون کون تھے کل دوست المعی
اپنا شریک آج کی مشکل میں کون ہے؟

۱۰ر جمادی الاول سنہ ۱۳۴۳ھ جمعہ

نسیمِ بہار نے

ٹھنڈا کیا جو ہم کو نسیمِ بہار نے
سلگائی آگ چار طرف لالہ زار نے

ہم غافلوں کو پھر نہ ہوا جاگنا نصیب
دی کروٹیں بہت ہمیں لیل و نہار نے

ماتم کیا ہماری مرادوں کی موت کا
ڈھانکا جہاں کا منہ شبِ تاریک و تار نے

دیکھا گھسیٹتے ہوئے اپنے کو آپ پاؤں
منزل کا میری قصد کیا جس سوار نے

وہ آ کے چھپ چھپ گئے جبکہ بجھ گیا
کیا آنکھ مار دی ہے چراغِ مزار نے

دھمکی میں کل کی صبح سے ہے زرد آفتاب
جاتے ہوئے جو دی ہے شبِ ہجرِ یار نے
سالک کا اس طرح سے کہاں کانپتا تھا دل
کیا پاؤں رکھ دیا ہے کسی بادہ خوار نے
میں میکدے سے دوڑ کے دامن میں جا چھپا
رحمت جو بھیج دی مرے پروردگار نے
کیا جانے اس کی زد سے بچے کون المعی
حملہ کیا ہے شہر پہ اک نیزہ دار نے

۲۴ جمادی الاول ۱۳۴۳ھ جمعہ

آنے کی خبر کی

وحشت سے ترے حشر میں آنے کی خبر کی
سَو بار اُنہیں پاؤں تلے سے مرے سر کی

میں بھاگ کے جنگل میں جو پہنچا مرے پیچھے
دیکھا کہ چلی آتی ہے وحشت مرے گھر کی

رہ رہ کے دکھائے کوئی بجلی کا چمکنا
چشمک ہے چراغوں پہ مرے داغِ جگر کی

تھا آنکھ ہی تاروں کی بچانا تمھیں دشوار
لو جھانک رہی ہے وہ سفیدی بھی سحر کی

منزل کی اقامت نے مجھے لوٹ لیا ہائے!
چادر بھی نہ چھوڑی مری اک گردِ سفر کی

پکڑے ہی گئے ہم تو کیا زخم نے کیا کام
باتیں مرے واعظ کی ادھر کی نہ اُدھر کی
مفلس کو یکایک کر الہٰی نہ توانگر
اک آگ ہی لگجاتی ہے اخلاق کو زر کی

صفر ۱۳۴۵ھ

مال کا

سایل ہے زاہدوں کے فقط اس مال کا
دیکھو تو حوصلہ مرے دست سوال کا

مشرق سے کل ظہور ہے اس کے جمال کا
جس نے کہ تاج عید کو بخشا ہلال کا

دل مجھ گناہ گار کا بھی کھینچتا کبھی
ان واعظوں کا وعظ نہ سُر کا نہ تال کا

طفلی کی سادگی نہ بھلا دو شباب میں
پہنو تو پھر لباس وہ تم اگلے سال کا

آئے تھے پوچھتے ہوئے وہ پوچھ کر گئے
اُن کو مگر پتہ نہ ملا میرے حال کا

تصویر میری سامنے آنکھوں کے کھینچ دی
سایہ پڑا زمیں پہ جب اس نونہال کا

کیونکر بجھے گی پیاس ہمارے مذاق کی
اے الہٰی زمانہ ہے قحط الرّجال کا

شعبان ۱۳۴۵ھ

آفتاب کو

پالا پڑا ہے دل سے رُخِ بے نقاب کو
دیکھو دکھا رہا ہوں چراغ آفتاب کو

کچھ کم نہ تھا میں واقفِ آدابِ بزمِ ناز
آنے نہ دیا منہ پہ کبھی اضطراب کو

بجھتے دکھا دوں آگ کے شعلے میں ساقیا
ایک ایک گھونٹ کر کے اُتاروں شراب کو

کل بھی ملے وہ اُن سے جو ملکر چلا ہے آج
دنیا میں دیکھنا ہو اگر انقلاب کو

اس روئے تابناک کا پلّہ جھکا رہا
آنکھوں نے میری تول دیا آفتاب کو

کیوں تم نے آئینہ میں یہ پیدا کیا جواب
مارا اٹھا کے منھ پہ تمھارے جواب کو

باہر کرینگی ہاتھ پکڑ کر یہ شوخیاں
آنکھوں کے گوشے گوشے سے اُن کے حجاب کو

سُرخی سے دھیمے دھیمے سلگنے لگے ہیں گال
پھونکا ابھی کسی نے تمہارے شباب کو

ہنستے ہوئے تو دیکھ لیا اِن کو المعیؔ
کہیے چمن میں کس نے کھلایا گلاب کو

۲۶ ؍ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۵ھ

ہوگئے ہم

اک گھونٹ میں پاک ہوگئے ہم
میخانے سے دل کو دھو گئے ہم

صدمے نہ شبِ فراق کے پوچھ
دیکھی جو سحر تو سو گئے ہم

یاد آگئیں کب کی اپنی باتیں
ایک ایک کھنڈر کو رو گئے ہم

ہستی کو شرار کر دکھایا
یہ آئے جہاں میں وہ گئے ہم

مسجد میں نہ تھے بہت نمازی
گنتے ہوئے ایک دو گئے ہم

ورنہ انھیں قدرِ گل نہ ہوتی
کانٹے بھی چمن میں بو گئے ہم
جانے کدھر آ پڑے ہیں اے دشت
اُف تیری فضا میں کھو گئے ہم
ساحل سے بھی کب چلے تھے بے فکر
کشتی ہی مگر ڈبو گئے ہم
اتنا ہی تو المعی ملا دودھ
جس میں کہ روٹی بھگو گئے ہم

۵ شعبان ۱۲۱۱ یکشنبہ

زمانے میں

امید تھی کہ قیدِ قفس کے زمانے میں
دم لیگی آکے بادِ خزاں آشیانے میں
ہم جیسے رند بادۂ غفلت چڑھانے میں
اک دَور چل رہا ہے ہمارا زمانے میں
صورت کہاں بدلتی ہے بدلا کرے لباس
پکڑا گیا ضمیر مرا ھر بہانے میں
تھی میرے سر رگڑنے کی جا جلوہ گاہ طور
چمکا رہا ہوں برق ترے آشیانے میں
لینگے مزے۔ کہ بات کا دینگے مری جواب
مصروف ہیں وہ بات کو اپنی چبانے میں

شہرت نے اک حسین تجھے ثابت تو کر دیا
کیا شرم رہ گئی ہے فقط منہ دکھانے میں

اب تک مقامِ بندہ نہ دیکھا تھا المعی
آئی نظر زمیں ہی زمیں سر جھکانے میں

۲۳ ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ جمعہ

بادِ سحری اٹھی

پھولے یہ گل آنکھوں نے بخشی جو تری اٹھی
پھیلی مری آہوں میں بادِ سحری اٹھی

ناکام یہی ارماں آیا تھا کبھی دل میں
شاید کوئی کونپل بھی پھوٹی ہو ہری اٹھی

رندوں کی جماعت میں بڑھ بڑھ کے تری باتیں
کس نے تجھے اے واعظ دی معتبری اٹھی

پوچھا کہ مرے دل میں کس طرح سمائے تم
ہو جاتی ہے وہ بولے شیشے میں پری اٹھی

کھلتی نہ مری حالت تارے پہ گھڑی بھر کے
صبحِ شبِ فرقت نے کی پردہ دری اٹھی

کہدیں جو نہ تھی باتیں کہنے کی چھلک اٹھا
زاہد کے پیالے میں ساقی نے بھری اٹھی

۲۰ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ

دِل میں آگئی

دل ہی میں رہ گئی جو مرے دل میں آگئی
نکلی تو آرزو تری محفل میں آگئی

بے تابیوں نے ہجر کی اے دل کیا تباہ
بجلی یہ لوٹ کر مرے حاصل میں آگئی

پہلے سے جمع کی ہیں تری مسکراہٹیں
کیا روشنی یوں ہی مہِ کامل میں آگئی

ساقی نہ کچھ بھی حوصلے اپنے دکھا سکا
نیت ہماری کاسۂ سائل میں آگئی

اک روز راستے ہی میں ٹھیرا لیا مجھے
واماندگی بھی میرے منازل میں آگئی

ہلکے کیے تھے کچھ مرے جوشِ جنوں نے پاؤں
جھنکار پھر سمٹ کے سلاسل میں آگئی

آتی ہوئی فقط نظر آئی مجھے امید
اک موج تھی کہ دامنِ ساحل میں آگئی

اتنی سی چیز کو بھی نہ واعظ بچا سکا
مے میری گھونٹ بھر بھی مسایل میں آگئی

۵ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۶ھ جمعہ

مخمور ملے

شیشے رندوں ہی کے مسجد میں کہاں چور ملے
شیخ بھی نشۂ تقویٰ میں تو مخمور ملے

منزلِ کُن میں کس آرام سے دیکھا اُن کو
دیر سے آئے اُنھیں راہ میں ہم دور ملے

یا تو ملتے ہی نہ تھے اور ملے جب یہ حسیں
دل کے مقبول ملے آنکھ کے منظور ملے

ہم جو پہنچے تو لگائے ہوئے مہندی پایا
دست و پا بستہ ملے ہم کو وہ مجبور ملے

رات کا وقت ہے ناکس سے یہ صحبت کیسی
چودھویں چاند سے تیرا رُخِ پُرنور ملے

شیشئہ ساغر پہ مرے کھولدیے ساقی نے
آج کیا تازہ ٹپکتے ہوئے انگور ملے

وہ نہ سمجھیں گے کہ دی کس نے تڑپتے ہوئے جاں
میں سرِ خاک ملوں دار پہ منصور ملے

میرے جل جانے کا وادیٔ ایمن ہے مقام
المعیٰ جلوہ دکھانے کو انھیں طور ملے

۱۹ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ جمعہ

نکل گیا

رندوں میں شیخ کا جو بھرم تھا نکل گیا
تھا لکۂ سحاب کہ برسا نکل گیا
دست جنوں تھے اب کے معطل بہار میں
خود جا بجا گلوں کا انگرکھا نکل گیا
میں آج تک عدو کو سمجھتا رہا حقیر
شکرِ خدا کہ آنکھ سے تنکا نکل گیا
عدموں سے تیرے عشق کے لالہ ہوا نمود
پتھر کا صاف منھ سے کلیجہ نکل گیا
بازی نسیم صبح نے گلشن میں ہار دی
آئے گئے سرے شباب کا جھونکا نکل گیا

مرکز سے کب جنوں نے بھٹکنے دیا مجھے
میں منہ اٹھا کے دشت کو سیدھا نکل گیا

میداں دماغ و دل کے مرے خشک ہو گیے
آنکھوں سے موج مار کے دریا نکل گیا

ہم بیکسوں پہ کیا متوجہ ہوئی نگاہ
جانے کا دل میں آپ کے رستہ نکل گیا

وہ ہاتھ مجھ سے پوچھ کہ جس ہاتھ سے درست
نک سنگ سے ایک خاک کا پتلا نکل گیا

میں مر گیا جو سب مرے ارمان نکل گئے
لیکن عدو کے گھر سے جنازہ نکل گیا

ملنا تھا حسن ہی مرے قاتل کو المعی
معدن میں سنگ سخت کے ہیرا نکل گیا

۹ صفر ۱۳۴۲ جمعہ

کیا جانے

میں ہوں یا میرا نام کیا جانے — کس کے ہیں سب یہ کام کیا جانے
کِھل رہے ہیں کہاں وہ خلق کے پھول — اس کو میرا اہتمام کیا جانے
عقل بولی کہ سخت ہاتھ نہ ڈال — نفس سرکش لگام کیا جانے
مجھ کو دھڑکا ہے جانتا ہوں میں — کوئی فرقت کی شام کیا جانے
مئے کو دیکھا ہے چکھ کے آ زاہد — تو حلال و حرام کیا جانے
کس کے یہ گل دماغ جھٹکے گا — کس کو ہو گا زکام کیا جانے

میں نہ آنکھوں سے مئے سڑپ جاؤں
کیوں یہ ساقی کے جام کیا جانے

۵ رجب ۱۳۴۷ھ

اور زیادہ

دینے کو ہیں صیقل تجھے ہم اور زیادہ
تڑپا ہمیں اے تیغ دو دم اور زیادہ

مسجد کو نہ تھامے مرے واعظ کی متانت
ہو جائے یونہیں سوجھ کے تھم اور زیادہ

بارش میں تو میخانے سے ڈرتا ہوں میں واعظ
ہاں میرا پھسلتا ہے قدم اور زیادہ

مل جائیگا دامانِ شبِ ہجر دمِ صبح
بھڑکے گی مری آتشِ غم اور زیادہ

اک آخری دیدار پہ ساقی کے چلے ہم
اک گھونٹ پہنچ جائے بہم اور زیادہ

پیشانی گھسوں میں درِ دولت پہ تمھارے
دو تم مری قسمت کو قلم اور زیادہ

محفل میں ہنے اور وہ بت دیکھ کے مجھ کو
بگڑا ہے برہمن کا دھرم اور زیادہ

ہم چاند سے انتیس کے سب عید منائیں
ابرو میں ترے چاہیے خم اور زیادہ

عشاق کو دیکھا کہ یو نہیں پوجنے بیٹھے
بے حس نظر آیا وہ صنم اور زیادہ

۱۱ شوال ۱۳۴۷ھ

بار بار کرکے

ذکر اس کا پاؤ گے کیا تم بار بار کرکے
بیٹھا ہے ایک گوشہ جو اختیار کرکے

مرتے تک اپنا شکوہ آنے نہ دیا لب پر
ظالم نے مجھ کو مارا امیدوار کرکے

جس زلف و رخ کو یارب بھائے تھے چھوڑ کر ہم
ڈالا ہمارے سر پر لیل و نہار کرکے

دل کس طرح چھپاؤں اپنا تمھیں بتاؤں
غیروں سے لیکر آؤں کچھ قرض اُدھار کرکے

زیور پہن کے تم نے آپ اپنی بت گری کی
بت گر بناتے ہیں تب نقش و نگار کرکے

اُف میری ہوشیاری اب تک بھی مبتلا ہوں
سو سو پیالے ساقی نذرِ خمار کرکے

لے لیگی تیغ موجِ بادِ بہار جس دن
جنگل کو چھوڑ دیگی سب لالہ زار کرکے

رندوں کو میرا واعظ مذہب پہ لا رہا ہے
جنت دکھا رہا ہے باغ و بہار کرکے

ملنے کا جبکہ وعدہ ہوتا ہے شب میں تنہا
تھک جاتے ہیں سحر تک ہم انتظار کرکے

کنزِ خفی سے جب سے نکلا ہے المعی وہ
رکھتا ہے ساتھ ہم کو آئینہ دار کرکے

۱۸ صفر ۱۳۴۸ھ جمعہ

ستم ایجاد کیا

اک نیا اور بھی اس نے ستم ایجاد کیا
یعنی عادت کے خلاف آج مجھے یاد کیا

عشق نے جبکہ دکھائی ہمیں اپنی صورت
پیشکش آئینۂ حسنِ خدا داد کیا

سارا عالم متوجہ نظر آیا ۔ مجھ کو
شب کی خاموشیوں نے مائلِ فریاد کیا

اس کی زینت ہیں وفا اور جفا دونوں بھی
جب مجھے شاد کیا غیر کو ناشاد کیا

تم نے اُس دم سے جو پھونکا تھا سرِ بزمِ ازل
یاں مری خاک اُڑائی مجھے برباد کیا

شاخِ گل میں کبھی جس طرح نکل آئے کلی
ہیں نے آپ اپنے کو نذرِ کفِ صیاد کیا

ہائے خلاقِ دو عالم مرے فارغ دل کو
تو نے ایسا ہی ان ارمانوں سے آباد کیا

ہو گئے اسرار کچھ اس کی چمن آرائی کے
ہم کو سبزہ ہی بنایا تمھیں شمشاد کیا

ہو گیا آپ کی مخلوق سے ہر ایک غلام
اپنے بندے کو اگر آپ نے آزاد کیا

کر دیا پہلی نظر میں مجھے اے المعیؔ مست
میکدے ہی کی طرف شیخ نے ارشاد کیا

۳ ربیع الاول [illegible] جمعہ

مقدّر نہ ہوا

بہتر ہیں گریہ و زاری سے مقدّر نہ ہوا
آج تک اشک کا قطرہ کوئی گوہر نہ ہوا

عالمِ آراستہ قدرت کے فراخور نہ ہوا
تیری دہلیز ہوئی اور مرا سر نہ ہوا

اور ملتی مری وحشت کو ترقی کی جگہ
مر رہا ہوں کہ بیاباں میں کوئی گھر نہ ہوا

بحرِ عصیاں کو یونہیں میں نے کیا چل کے عبور
پانی اتنا ہے کہ دامن یہ مرا تر نہ ہوا

پست و بالا ہی نظر آئے حسینانِ چمن
کوئی اس قدِ متناسب کے برابر نہ ہوا

میری رندی میری فطرت کا تقاضا تو نہیں
ہاتھ چلّو ہے اگر ہاتھ میں ساغر نہ ہوا

پھینک دیتا ہے سرِ ساحل مرے ارمانوں کو
موجزن ہی کبھی ایسا دلِ مضطر نہ ہوا

حسن دیتی ہے شجاعوں کو تواضع - ورنہ
کوئی تلوار کا ٹکڑا ہے جو خنجر نہ ہوا

نیند پھرتے رہے آنکھوں میں برابر شبِ ہجر
ایسے کانٹوں میں ہمارا کوئی بستر نہ ہوا

اُن سے مل کر بھی نہ بر آئی تمنّا میری
آنکھیں روشن ہوئیں دل میرا منوّر نہ ہوا

غصّہ رندوں پہ کیا المعیؔ واعظ نے بہت
اور شریعت کے بھی جامے سے وہ باہر نہ ہوا

غرہ شعبان ۱۳۸۲ھ پنجشنبہ

مناظر و اخلاق

ایک متوالا

مال و دولت کا ایک متوالا
عیش و عشرت کی گود کا پالا

سرخ چہرہ سفید بھک پوشاک
صبح کے وقت میں گلِ لالہ

گردن و سر کہ سرکشی کی مشین
آنکھ اونچے خیال کا آلہ

منھ پہ آماس تھا کہ استغنا
دیکھ سکتا تھا دیکھنے والا

حلقہ باندھے ہوئے حریص و خسیس
اُس کے اطراف جس طرح ہالہ

کر رہی تھیں ہر ایک کے دل پر
حرکتیں اُس کی سحرِ بنگالہ

بات سے ایک کو کیا مرعوب
چال سے ایک پر اثر ڈالا

گاہ بے حس و مس بنا پتھر
گاہ آتش کا ایک پرکالا

ہنس دیا بات بات پر بے وجہ
جیسے اک دل کی بات کو ٹالا

صورتِ حال سے وہ کہتا تھا
آج میرا ہی بول ہے بالا

جس کو بے فکر کہتے ہیں میں ہوں
مجھ کو غم سے پڑا نہیں پالا
میں نے کھائی نہیں ہے گرم ہوا
ہوں اک ایسا درخت ہریالا
کوتہ اندیش اس کے رشک میں تھے
آہیں کرتے تھے اور کبھی نالہ
اک فقیر اس کو دیکھ کر بولا
خوب دنیا نے تیرا گھر گھالا
سبز باغ اک دکھا دیا تجھ کو
یہ ہے اک خوفناک دلّالا
تیرے دل کو کہاں ہے اطمینان
کل کے دھڑکے سے ہے تہ و بالا
تلفِ مال کا ہے ڈر ہر وقت
گنج پر کھیلتا ہے اک کالا
خوش تو ہم ہیں بجاتے بیٹھے ہیں
چار عنصر سے اپنے چوتالا
لنگلے کے زیر و لنگلے کے بالا
نے غمِ دزد نے غمِ کالا

ترا حال برا ہے

کل میں جو لگا کرنے ملامت کہ تو لڑکے
عبرت کا نمونہ ہے ترا حال برا ہے

تو اُن کی ہے اولاد کہ قسّامِ ازل نے
اعزاز شرافت جنھیں حصے میں دیا ہے

اُگتے ہوئے پودے کے جو ایسے ہوئے پتّے
اس باغ کا آگے کو نگہبان خدا ہے

طفلی تری بھولی نہیں۔ تھا بسکہ تو ابتر
آنکھوں ہی جو دیکھا ہے نہ کانوں ہی سنا ہے

میلا کبھی تو اور جو ضد چڑھ گئی تجھ کو
جتّو ہی سے بہلانہ بی شادی سے ڈرا ہے

پھر خیر جو خواہش ہوئی پوری تری۔ ورنہ
ریں ریں کا ہے چرخہ کہ لگاتار چلا ہے
چونچال ہوئی کچھ جو سمجھ آگئی تجھ کو
شیطان کے بھی کاٹ کے تو کان رہا ہے
مارا جو یہاں اِس کو تو منھ اُس کا چڑایا
چھوٹا تجھے چھوٹا نہ بڑا تیرا بڑا ہے
ہمجولیوں کے ساتھ اگر کھیل ہے منظور
یہ ربط بڑھایا ہے کہ پیٹھوں میں گھسا ہے
نچلا نہ رہے ایک نہ اک چھیڑ نکالے
لڑنا تجھے سوجھا ہے تو ناحق بھی لڑا ہے
نیرنگِ زمانہ ہے فقط تیرا تلوّن
ہنستا ہے تو ہنستا ہے خفا ہے تو خفا ہے
گھنّی کبھی سادھی ہے تو گھر کر دیا سنسان
جب شور مچایا ہے فلک سر پہ لیا ہے

یوں آنکھ بچی اور تو گھر سے ہوا چمپت
پھر خاک اڑاتے ہوئے رستوں پہ ملا ہے
سر پیر برہنہ ترا پاجامہ کچھ ایسا
سنتو جاے سے نکلا ہے گریبان پھٹا ہے
آلودۂ گرد ایسا کہ منہ فق نظر آئے
تو نے کسی جوگی ہی کا یا سانگ بھرا ہے
لٹو نے لگایا ہے کہیں ڈور پہ تجھ کو
گر سر میں بھری تیرے پتنگوں کی ہوا ہے
تو ہے کہ سر راہ اگھوری کی طرح سے
کلا ترا چلتا ہے دکانوں پہ اڑا ہے
پیسوں کا اڑانا وہ چھنا چھن ۔ کہ زباں پہ
سوڑے کا ہے میوے کا مٹھائی کا مزا ہے
مکتب میں کئی بار بٹھایا تجھے لیکن
دل سے کبھی لکھا نہ توجہ سے پڑھا ہے

رکھا ہے سبق آگے پہ کیا کہتے ہیں تجھ کو
ہیں چھت کو نگاہیں تری قاتل نظرا ہے
اس کان سنا بات کو اس کان نکالا
بس ناک میں استاد کی اک تیر دیا ہے
نیچ اونچ کہاں اب تجھے دیتا ہے دکھائی
جب آنکھ میں ریعان جوانی کا نشہ ہے
گھر کرنے لگی دل میں ترے نفس پرستی
آرایش و پوشش میں فقط دھیان ترا ہے
فیشن نے کہیں کا بھی تو رکھا نہیں تجھ کو
ہر وقت ترا رنگ نیا ڈھنگ نیا ہے
کب دیتی ہے کچھ کام بنائی ہوئی صورت
جاہل ہے تو ہر ایک کی آنکھوں سے گرا ہے
مغرب کا اگر علم و ہنر لے تو میں جانوں
اس وضع کی تقلید میں کیا تیرا بھلا ہے
جو کام کرے چاہیے انساں کہ سمجھ لے

کیا مصلحتاً اور رواجاً بھی روا ہے
گر کسب کمالات کی جانب بھی توجہ
انزونے دماغ اور یہ دل سب کو دیا ہے
اوروں کی نہ کچھ رِیس نہ اپنا تجھے افسوس
غفلت کا یہ گھولا ہے کہ گھٹی میں پڑا ہے
تاکس جسے ہم جانتے تھے دیکھ رہے ہیں
بانٹے ہوئے اب تجھ سے برابر کا دھڑا ہے
دعوٰے شرافت ہی نہیں مایۂ عزت
تعلیم کی چلتی ہوئی جو پائی ہوا ہے
ہے علم جنھیں دولت و عزت بھی ہے اُن کو
طوطی اک انھیں کا ہے جو اب بول رہا ہے
تہذیب نے تیری ترا اخلاق بھی کھویا
گفتار میں نرمی ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے
مذہب کی سبک تیری نگاہوں میں حکومت
نیکی کی خبر اور نہ گناہوں کی سزا ہے

تو مانے عقاید کو نہ بے عقل لڑائے
پھر وہ بھی جو سمجھا ہے زمانے سے جدا ہے

بیزار مگر کام کی باتوں سے ترا دل
ہاں اور کوئی کام ہو مانا کہ بُرا ہے

ازبسکہ خرافات میں دن کٹتا ہے سارا
پھر شب سے بھی امید تلافی تجھے کیا ہے

چھوڑیگی ترا ساتھ نہ قسمت کی خرابی
غرقاب ہے تو گردش ساغر میں گھرا ہے

اندھیرے ہے رات گئے گھر نہیں جاتا
جس گھر میں تجھے کہتے ہیں سب گھر کا دیا ہے

وہ جوہر قابل مری باتوں پہ یہ بولا
جو آپ کا کہنا ہے درست اور بجا ہے

اے المعی الزام مجھی پر نہیں اس کا
باوا کا تغافل ہے یہ اماں کی خطا ہے

وا کر نہ سکے آنکھ بھی جو ضعف کے مارے
اُٹھ بیٹھی ہے بچے کی محبّت کے سہارے
پہلو میں سلا لیتی ہے اُس لختِ جگر کو
زانو پہ بٹھا لیتی ہے اس لختِ جگر کو
ہاتھوں میں اُٹھا لیتی ہے اس لختِ جگر کو
چھاتی سے لگا لیتی ہے اس لختِ جگر کو
سینے سے اُچھلتا ہے لہو ہاتھ بھر اس کا
جب دودھ پلا دے تو ہو ٹھنڈا جگر اس کا
خوش ہوتی ہے اُس کا کبھی منہ ہاتھ دُھلا کے
کرتی ہے کبھی پیار اُسے پوشاک پہنا کے
ہنس دیتی ہے کاجل کبھی آنکھوں میں لگا کے
خود دیکھ کے اور دیکھنے والوں کو دکھا کے
بعینا کوئی اس فطرتِ مجبور کو دیکھے
بچے سے نہ اب پھر کے بھی وہ حور کو دیکھے

ماں کی محبت

جاں بخش ہے اور روح فزا ماں کی محبت
ہے گلشن جنت کی ہوا ماں کی محبت
ہے راحت و تسکیں کی بنا ماں کی محبت
رحمت ہے خدا کی بخدا ماں کی محبت
اللہ کی رحمت ہے غرض جس میں ہیں ہے
یا ماں کی محبت ہے غرض جس میں نہیں ہے
تا وضع تو سو طرح کے وہ رنج اٹھائے
اور منہ میں دم وضع فقط موت کے آئے
اولاد کی صورت جو خدا اس کو دکھائے
بستر پہ پڑی شکر کرے عید منائے

جب پاؤں وہ چلتا ہے بچھا دیتی ہے آنکھیں
منہ ملتی ہے تلووں سے چھوا دیتی ہے آنکھیں
ہو جاتی ہے ساتھ اس کے لگا دیتی ہے آنکھیں
گھورے اسے کوئی تو دکھا دیتی ہے آنکھیں

کرتی ہے دُعائیں نظرِ بد سے بچائے
اللہ تجھے ہر اثرِ بد سے بچائے
سنبھلے ہوئے چلنا مرے جانی تجھے آئے
قابو کی کوئی چال دکھائی تجھے آئے

بڑھ جائے یہ قد جوشِ جوانی تجھے آئے
تو سرو بنے اور جوانی تجھے آئے
بوٹا سا یہ قامت کہ سن و سال کے صدقے
ماں تیری ہمکتی ہوئی اس چال کے صدقے

بدر رُو ہے یہ یوسف ہی وہ بازار میں اُس کے
بکتا ہے مگر فرق نہیں پیار میں اُس کے

کوشش ہے ہر اک رمز کے اظہار میں اُس کے
ہوتے ہیں بیاں بیٹھے ہوئے چار میں اُس کے
بن بن کے ہر اک چال دکھاتی ہے اُسی کی
آواز بھی باتوں میں بناتی ہے اُسی کی
بیمار اگر وہ گلِ گلزار ہوا ہے
پھر ماں کے گلے کا ہی کوئی ہار ہوا ہے
آغوش کا عادی جو ستم گار ہوا ہے
جھولے میں بھی سونا اسے دشوار ہوا ہے
تھک کے بھی دریغ اس سے تلطف نہیں کرتی
پھرتی ہے اٹھائے ہوئے لیکن اُف نہیں کرتی

رُباعیات

رباعی

طرزیں یہاں کی ناپسند ساری مجھ کو
دنیا میں مناسبت ہی پیاری مجھ کو
اے المعی خاک سے ہوا ہوں پیدا
آتی ہے پسند خاکساری مجھ کو

۱۴ شوال ۱۳۲۵ھ پنجشنبہ

ولہ

دنیا کی موافقت پہ سرمست ہوں میں
سمجھا ہوں کہ ہر طرح زبردست ہوں میں
جب آنکھ اٹھا کے آسماں کو دیکھا
معلوم ہوا کہ کس قدر پست ہوں میں

۱۴ شوال ۱۳۲۶ھ دوشنبہ

ولہ

وہ دور گزر گیا کہاں آتا ہے
اب ایسی ریاضتیں کوئی لاتا ہے
کیا یاد خدا انھی اور کیسے تھے وہ لوگ
ہم کو تو خدا ہی یاد آجاتا ہے

۱۴ شوال ۱۳۲۷ھ جمعہ

رباعی

اپنی تعریف اور زبانی اپنی — غیروں کو جتائیں نکتہ دانی اپنی
صد شکر اکڑ مکڑ نہ آئی ہم کو — ننگ پیری سہی جوانی اپنی

۱۴ شوال ۱۳۴۷ھ جمعہ

ولہ

کچھ جبر بھی اپنے دل پہ چاہیے تو کہوں — اخلاق کو ذرا نباہے تو کہوں
اے المعی دوستوں پہ نازاں ہے بہت — دشمن بھی تجھے سراہے تو کہوں

۱۴ شوال ۱۳۴۷ھ جمعہ

ولہ

کیسا ہی وہ کام ہو مزہ دیتا ہے — جو شر و فساد کو مٹا دیتا ہے
جھک کر ملتا ہوں دشمنوں سے کہدو — جھکنا ہی اگر ان کو جھکا دیتا ہے

۱۹ صفر ۱۳۴۸ھ چہارشنبہ

رُباعی

رکھ پیر مغاں سے المعی میل ذرا
ہے لطف بجو طعن خلق بھی جھیل ذرا
کہتا ہے کھلا ہوا یہ باب توبہ
اے رند خراب اور کھل کھیل ذرا

۲۶ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ

(ولہ)

انساں کو مخقلتوں کا اک چسکا ہے
یہ خوف و رجا کے درمیان لٹکا ہے
دل تیرا دھڑک رہا ہے دیکھ اے غافل
مرنے کا لگا ہوا یہی کھٹکا ہے

۲۹ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ

(ولہ)

عالم یہ مسافرت کا بازار ہوا
آیا کوئی جانے کوئی تیار ہوا
اے المعی سر میں بال آیا ہے سفید
ہشیار خط سحر نمودار ہوا

۲۸ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ

رُباعی

حق نے مجھے خاک سے چنیدہ بھی کیا
صد شکر کہ اسم بامسمی بھی کیا
کیونکر نہ غرورِ خاکساری ہو مجھے
جب مجھ کو ملائکہ نے سجدہ بھی کیا

۱۳ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ

ولہ

مضمون جھلک دکھا کے رہ جاتا ہے
کچھ اوجِ خیال پا کے رہ جاتا ہے
اے المعی توڑ آسماں کے تارے
کیوں ہاتھ بڑھا بڑھا کے رہ جاتا ہے

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ

ولہ

پھولا ہے وہ گل کہیں یہ جس کی بو ہے
جاری کسی چشمے ہی سے آبِ جو ہے
مخلوق سے تیری تیرا پاتا ہوں پتہ
جس سمت کو دیکھتا ہوں تو ہی تو ہے

۱۰ جمادی الاول ۱۳۲۸ھ

رُباعی

ہر داغ کو دل پہ ہنس کے سہ لیتا ہوں
دنیا کے ملال و رنج سہ لیتا ہوں
دشمن کو بُرا کہنے کی تکلیف نہ ہو
اپنے کو بُرا آپ ہی کہہ لیتا ہوں

۱۸ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۲۸ھ

ولہ

غصہ جو شباب میں چمک جاتا ہے
اک بات پہ نو جواں بھڑک جاتا ہے
ہوتا ہے جوانی میں بہت خوں پیدا
جنبش سی ہو بھرا ظرف چھلک جاتا ہے

۳۰ جمادی الثانی سنہ ۱۳۲۸ھ

ولہ

کیفیتِ دل زباں پر کب آتی ہے
تصویرِ معانی کی نظر کب آئے
دس سال میں لفظوں کو بٹھانا آیا
کیا جانیے کلام میں اثر کب آئے

۱۶ رجب سنہ ۱۳۲۸ھ

رُباعی

جس وقت کہ موت یاد کرتی ہوگی
پیمانۂ زندگی کو بھرتی ہوگی
ہم دیکھ کے اس کا حال رو دیتے ہیں
مرنے والے پہ کیا گزرتی ہوگی

۱۰ رجب ۱۳۲۸ھ

ولہ

تہذیب سے جس کی آنکھ کچھ بینا ہے
فیشن ہی پہ اُس جوان کا جینا ہے
کیا کیا شکلیں اسے بدلتے دیکھا
گویا بچے کے آگے آئینہ ہے

۲۷ رجب ۱۳۲۸ھ

ولہ

جن سنگدلوں سے تجھ کو کد ذاتی ہے
نرمی کوئی اُن کے ساتھ کام آتی ہے
دشوار ہے بچ سکے کہاں تک اے دل
دانتوں میں زبان ضرور آجاتی ہے

۲۹ شعبان ۱۳۲۸ھ

رُباعیٔ

کب کوئی یقیں اپنے سر لیتا ہوں
اک رنگ میں دن عمر کے بھر لیتا ہوں
سمجھا ہوں کہ مالک ہے مرا گنہ نواز
نیکی بھی کبھی ذرا سی کر لیتا ہوں

۴ رمضان ۱۳۲۸ھ

وله

اتنا نزدیک ہے کہ پایا نہ گیا
ایسا کچھ صاف ہے کہ سمجھا نہ گیا
ظاہر ہے وہ ذوالجلال پر دیکھے کون
دوپہر کو آفتاب دیکھا نہ گیا

۲۹ رمضان ۱۳۲۸ھ

وله

جب بدن سے روح تنگ آتی ہے
کیا کیا کہوں پیچ و تاب کیا کھاتی ہے
لیکن آرام دہ ہے یہ بستر مرگ
لیٹے ہی لیٹے ہی آنکھ لگ جاتی ہے

۱۳ شوال ۱۳۲۸ھ

رُباعی

ہر اک کو مرکے یاد آئیں اکثر
ہے فکر کہ نیکنام رہیئے کیونکر
رونے والا بھی دے الٰہی ہم کو
مرنا تو کھڑا ہوا ہے اک ن سر پر

۱۷ جمادی الاول ۱۳۲۹ھ

ولہ

دنیا کی بُرائیوں پہ مرتا ہے
دھڑ دھڑ بھی کسی خیال سے کرتا ہے
آخر تجھے کچھ لطف نہ آیا اے دل
کرنے والا بھلا کہیں ڈرتا ہے

۱۸ جمادی الاول ۱۳۲۹ھ

ولہ

کیوں ظلم کا ہاتھ یاں دراز ایسا ہے
کھلتا نہیں کچھ کسی پہ راز ایسا ہے
انساں کو خیال جانور کو پروبال
دیکھو یہ جہاں کہیں نواز ایسا ہے

۲۹ رمضان ۱۳۲۹ھ

رُباعی

نفرت کبتک جہاں کے چالوں سے کروں — کچھ شغل بھی آج کے خیالوں سے کروں
تیار ہوں المعی لگا کر عینک — چار آنکھیں نئی روشنی والوں سے کروں

۲۱ محرم ۱۳۳۰ھ

ولہ

ان دوستیوں کا دل مزہ پائیگا — مرجائیگا رنج ساتھ لیجائیگا
جھوٹوں نہیں پوچھتے ہیں اچھا کبھی — پھر قبر پہ چل کے ہائے کون آئیگا

۱۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ

ولہ

نابود کسی طرح سے ہونا ہے تجھے — بیکار منہ آنسوؤں سے دھونا ہے تجھے
میں بھی اُسی بیکسی کا مارا ہوں یہاں — اے شمع مزار حسن کا رونا ہے تجھے

۴ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ

رُباعی

مرنے سے یہ خوفناک ہی رہتا ہے | ہر یاس میں کچھ انہماک ہی رہتا ہے
سمجھا نہیں آدمی نے گھر کی چھت کو | زندہ بھی یہ زیرِ خاک ہی رہتا ہے

۱۴ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ

ولہ

الجھا ہوا دنیا کے میں دھندوں میں ہوں | بس فکرِ معاش کی کمندوں میں ہوں
اک وقت تو اُس کی یاد آئے افسوس | کس طرح کہوں خدا کے بندوں میں ہوں

۲۷ جمادی الثانی ۱۳۳۰ھ

ولہ

کیوں رئیس ملازم کی دلا کرتا ہے | نیچے پتھر کے ہاتھ جو دھرتا ہے
نپٹا کے سب اپنے کام خوش بیٹھے ہیں | یہ بعد ادائے فرض بھی مرتا ہے

۱۰ رجب ۱۳۳۰ھ

رُباعی

کعبہ ہو کہ دیر ہے ترا گھر نکلا — ہر دل میں ترا پتہ برابر نکلا
بے دین ہزار تجھ سے بھاگا لیکن — اللہ نہیں تو منھ سے نیچر نکلا

۲۷ رمضان سنہ ۱۳۳۰ھ

ولہ

سمجھیں تو خطاب ان سے ملا میرا ہے — نافہم پہ کب کوئی گلہ میرا ہے
سب کو سنتے ہیں خوش کئے دیتا ہوں — سمجھی ہوئی واہ واصلہ میرا ہے

۸ شوال سنہ ۱۳۳۰ھ

ولہ

کیا ہم سے کسی کا کام رہ جائے گا — اک ذکر تو صبح و شام رہ جائیگا
کچھ کسب کمال کر ہم آگئے اے دل — مرجائیں گے اور نام رہ جائیگا

۱۰ شوال سنہ ۱۳۳۰ھ

رُباعی

فیشن کے تکلفات سے ہاتھ اٹھاؤ
تعلیم کے مقصدِ حقیقی کو پاؤ
اک بات کہوں میں نوجوانو تم کو
صورت پر نہ جاؤ اپنی سیرت کو بناؤ

۱۰ شوال ۱۳۳۰ھ

ولہ

آیا ہے یہاں سے تو گذرنے کے لئے
دنیا نہیں کچھ قیام کرنے کے لئے
گھر والوں کو ویران کھنڈر روتے ہیں
کیوں ہم نے بنایا ہمیں مرنے کے لئے

۱۲ شوال ۱۳۳۰ھ

ولہ

قسمت کا کہیں بگاڑ کہتے ہیں اسے
دیکھو ایمان کی آڑ کہتے ہیں اسے
اک عذرِ گنہ پہ میرے رحمت اُس کی
تل کے اوجھل پہاڑ کہتے ہیں اسے

۱۳ شوال ۱۳۳۰ھ

رُباعی

دل سے بالکل خیال اپنا نہ گیا
اپنے کو کبھی حقیر سمجھا نہ گیا
جینے کا بھی ہو کوئی سہارا آخر
مجبور ہوں عاجزی کا غرّا نہ گیا

۱۴ ذیقعدہ سنہ ۱۳۳۰ھ

بیٹھے ہوئے ایک بار چڑھ جاتا ہے
رتبہ پر خاکسار چڑھ جاتا ہے
طوفان ہیں آسمان پہ دیکھا ہوگا
مٹی کا یہی غبار چڑھ جاتا ہے

۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۳۳۰ھ

ولہ

یوں عیب تو کچھ نہ کچھ بشر میں ہوگا
ہوگا جو خلق کی نظر میں ہوگا
معلوم نہیں مگر ریاکاروں کو
باہر وہی آئیگا جو گھر میں ہوگا

۱۸ ذیقعدہ سنہ ۱۳۳۰ھ

رُباعی

امید رہی نہ کچھ قویٰ سے تو کیا — داڑھی کو اگر رنگا حنا سے تو کیا
یاد آئیگی المغیٰ جوانی ہم کو — بڈھے منھ پر ہوے مہاسے تو کیا

۱۹ ذیقعدہ ۱۳۳۰؁

ولہ

بے ہاتھ لگائے اک نظر دیکھ لیا — خوش تھا کہ سب اپنا مال و زر دیکھ لیا
سایل کو جو دیکھا تو پڑا زردہ بخیل — گویا ملک الموت نے گھر دیکھ لیا

۹ جمادی الاول ۱۳۳۱؁

ولہ

جیتے تھے ہم آج تک اسی دن کیلئے — تو نے رکھ رکھ کے دل پہ داغ دیئے
اب رشتۂ زندگی کو کاٹ چکا — اے نجبت سیاہ تیرا کاٹا نہ جیئے

۲۱ رجب ۱۳۳۱؁

رباعی

جو لوگ کسی طرف ڈھلا کرتے ہیں — کچھ دیر گئے ہاتھ ملا کرتے ہیں
اے المعی افراط نہ تفریط اچھی — اچھے ہیں جو درمیان چلا کرتے ہیں

۲۰ رمضان سنہ ۱۳۳۱ھ

ولہ

جاتا ہے کدھر دلا! کہاں پھنستا ہے — کیچڑ میں ہوائے قفس کی دھنستا ہے
ہنستا ہے سیاہ رو مری باتوں پر — میں تو یہ سمجھتا ہوں تواہنستا ہے

۴ رمضان سنہ ۱۳۳۱ھ

ولہ

تو اور در ہر ناکس و کس کا ہے کو — گھر کا ترے کونا ہے یہ بس کا ہے کو
ہے مشک ہنر آپ مہک اٹھیگا — ناداں یہ شہرت کی ہوس کا ہے کو

۱۹ رمضان سنہ

رباعی

کب لازمۂ فن کا سرانجام کیا
رستے سے چلے نہ کچھ نیا کام کیا
اے المعی آسان سمجھ کر ہم نے
افسوس کہ شاعری کو بدنام کیا

۲۷ رمضان ۱۳۳۱ھ

ولہ

ظاہر سے یہ ساز باز توبہ توبہ
پوشاک کا اتنا ناز توبہ توبہ
منہ جانب قبلہ دل میں دنیا کے خیال
میں اور مری نماز توبہ توبہ

غرہ شوال ۱۳۳۱ھ

ولہ

شرمندہ ہوں یارب کہ خطاکار ہوں میں
ایسے جینے سے اپنے بیزار ہوں میں
تو ایک طرف یہ مجھے کرتے ہیں ذلیل
گویا ترے بندوں کا گنہگار ہوں میں

۳ شوال ۱۳۳۱ھ

رباعی

اک دم جہاں کی سیر میں بھول گیا کمزور نفس کے تار پر جھول گیا
اے المعی خالق بھی یہی کہتا ہوگا بندہ مرا بھولا ہے مجھے بھول گیا

۱۳ر ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ

ولہ

زنار کے توڑنے کا ساماں کر دے اور ذکر کو حرکت رگ جاں کر دے
بخشی گئی ہے دلوں پہ قدرت اس کو کافر کو وہ چاہے تو مسلماں کر دے

۱۴ر ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ

ولہ

اسلاف کا نام درمیاں ایسا ہے رسوا کر دے ورنہ جہاں ایسا ہے
طعنے دیتی ہے چال تیری تجھ کو تو ایسا تیرا خاندان ایسا ہے

۲۰ر ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ

رُباعی

اک عمر کا بندوبست بیکار گیا میں ضعفِ قویٰ کے سامنے ہار گیا
کچھ کہہ نہ سکا اور زباں ہو گئی بند ایسا ملک الموت کا ڈر مار گیا

۵ ر ربیع الاول ۱۳۳۲ھ

ولہ

یاں سے تجھے نیک نام اگر جانا ہے یاد اپنی دلوں میں چھوڑ کر جانا ہے
آزردہ ہو المعی نہ آزردہ کر دو دن جینا ہے اور مر جانا ہے

۵ ر ربیع الاول ۱۳۳۲ھ

ولہ

آپ اپنے سے حال بے خبر کس کا ہے؟ بد نام ہر اک زبان پر کس کا ہے؟
خود آج ہی وارثوں کے ہاتھوں میں تخیل گھر کس کا ہے، مال و زر کس کا ہے؟

۱۹ ر جمادی الاول ۱۳۳۲ھ

رُباعی

ہیٹا ہے مقدر کا بڑا اینٹا کر
سر لیے سر و سامان کھڑا اینٹا کر
آبا کا ہے نام اور کچھ تجھ میں نہیں
نادان! اکڑ ہی پڑا اینٹا کر

۱۹ رجمادی الاول سنہ ۱۳۳۲ھ

ولہ

پابندیِ عہد آج کل نام کی ہے
یا صبح کی منتظر ہے یا شام کی ہے
باتوں میں ہی احباب پھنس جاتے ہیں
ریت کی دیوار کسی کام کی ہے

۱۹ رجمادی الاول سنہ ۱۳۳۲ھ

ولہ

ہم اپنی جوانی کے جو دیوانے تھے
آج اس کے ضعیفی میں مزے پانے تھے
اے المعی گر گئے گھل گئے دانت
گویا منہ میں انار کے دانے تھے

۱۳ رجمادی الثانی سنہ ۱۳۳۲ھ

رُباعی

ہر وقت ہو کب جہاں کی رفتار بھلی
سنتا ہے بُری نہ یہ دلِ آزار بھلی
شکوہ کرتا ہوں دل کے سمجھانے کو
مشہور تو ہے "خالی سے تو بیگار بھلی"

۳۰ رمضان ۱۳۳۲ھ

ولہ

سوئے ہوئے بخت اگر جاگتے ہیں
کتنے ہی غرض کے دوست آ لاگتے ہیں
محتاج کے پاس پھٹکتا ہے کون
گرتی ہوئی دیوار سے سب بھاگتے ہیں

۵ شوال ۱۳۳۲ھ

ولہ

نیت نہ خراب کر بھلا ہوتا ہے
حق ہو تو حمایت یہ خدا ہوتا ہے
یوسفؑ کو عزیزِ مصر ہونا تھا ہوا
دشمن کی برائیوں سے کیا ہوتا ہے!

۱۳ شوال ۱۳۳۲ھ

رُباعی

مجھ کو جو تواضع کئی چند آتی ہے
ظاہرداری کی اس میں گند آتی ہے
اے المعیؔ دل کو پاک سمجھوں کیونکر
اپنی تعریف ابھی پسند آتی ہے

۶ر محرم ۱۳۳۳ھ

ولہ

بیٹھے ہوئے چھیڑ کر لڑا کرتا ہے
ہر روز فساد ایک کھڑا کرتا ہے
اے المعیؔ زندگی کے لطف اس سے نہ پوچھ
اوچھے سے جسے کام پڑا کرتا ہے

۱۵ر شعبان ۱۳۳۳ھ

ولہ

آتا ہے عتاب تو گھبراتا ہے
اظہارِ عنایت پہ ابھر آتا ہے
بے شرم نے سورج کو بھی دیکھا ہوگا
ہر روز عروج اور زوال سے ٹھہراتا ہے

۱۷ر شعبان ۱۳۳۳ھ

رُباعی

نسیان تو آدمی کی گھاتوں میں ہے
یاں ہے کہ گرفت باتوں باتوں میں ہے
تابع مجبور قدرت والوں کا
مردہ ہے کہ شیطان کے ہاتھوں میں ہے

۱۰ شعبان ۱۳۳۳ھ

(ولہ)

جب تک کہ ہے زندگی بلا بھی تو ہے
پھندے میں پھنسا ہوا گلا بھی تو ہے
دشمن کی تباہی پہ نہ خوش ہو اے دل
قسمت سے ترا معاملہ بھی تو ہے

غرۂ رمضان ۱۳۳۳ھ

(ولہ)

حاصل کبھی ہوتا ہے فروغ ایسا ہی
دیکھا کرتے ہیں سبز باغ ایسا ہی
ترانہ کبھی کسی کو فایدہ نہ پہنچا کر
جلتا ہے چراغ سے چراغ ایسا ہی

غرہ رمضان ۱۳۳۳ھ

رُباعی

دوڑاے ہوے خیال کی ٹیک ہے تو
امید دلِ ہر بد و نیک ہے تو
کرتا ہوں جب انتظامِ عالم پہ نظر
کہتا ہے یہ دل ایک ہے ایک ہے تو

غرۂ رمضان ۱۳۳۳ھ

ولہ

بھولی نہیں موت گو بُرے کام میں ہوں
کر رحم کہ تیرے دینِ اسلام میں ہوں
یوں بند ہوں دنیا سے الٰہی آنکھیں
سمجھیں مرے احباب کہ آرام میں ہوں

۴ شوال ۱۳۳۳ھ

ولہ

مقصود کی دور منزلیں پاتا ہے
جی نام سے شاعری کے تھراتا ہے
اس بات کا اشتیاق ادھر اور ادھر
حیران ہوں المعنی مجھ کو کیا آتا ہے

۲ شوال ۱۳۳۳ھ

رُباعی

کیا پوچھئے دشمنوں سے کیا کہتے ہیں دیکھا ہوا یا سنا ہوا کہتے ہیں
سچ ہے تو یہ احسان ہے اُن کا ورنہ کہنے دو اگر مجھ کو بُرا کہتے ہیں

۲۰ شوال ۱۳۳۳ھ

ولہ

عیبوں پہ نظر کسی کے زنہار نہ کر گر دیکھ لیا ہے کچھ تو اظہار نہ کر
اللہ سے کر دعا ہمیشہ اے دل سب کچھ کر مجھ کو تو دل آزار نہ کر

۱۰ شوال ۱۳۳۳ھ

ولہ

ہر بات میں ہر بات کے اظہار میں جھوٹ ایسی پستی میں اور ادبار میں جھوٹ
اے قوم کا نام لینے والو! افسوس چار آدمی کل قوم کے اور چار میں جھوٹ

رُباعی

ہوں سب سے الگ اکل کھرا میں ہی ہوں — بے تالا اور بے سرا میں ہی ہوں
سنتا نہیں۔ کہتا نہیں کرتا نہیں کچھ — سچ کہتی ہے دنیا کہ بُرا میں ہی ہوں

۱ محرم سنہ ۱۳۳۴ھ

ولہ

گالی کوئی بدزبان کیا دیتا ہے — ہاتھوں میں ہر اک کے آئینہ دیتا ہے
تم صبر کرو، اپنی شرافت کو دکھاؤ — وہ اپنی شرافت کو دکھا دیتا ہے

۹ صفر سنہ ۱۳۳۴ھ

یاں عقل کا مشورہ بلا ہوتا ہے — مذہب کا تتبع ہی بھلا ہوتا ہے
اے المعی ہو جاتی ہیں آنکھیں بیکار — مشعل سے اگر مقابلہ ہوتا ہے

۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۴ھ

رُباعی

پردیس کی یادِ بیکسی آتی ہے
پہلے بھی جو تھی خوش نفسی آتی ہے
بچھڑے ہوئے احباب جو مل جاتے ہیں
اشک آنکھ میں اور لب پہ ہنسی آتی ہے

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ

ولہ

غافل کو سزا عار سمجھ کر بخشے
غفلت میں گرفتار سمجھ کر بخشے
اے المعی یہ حوصلۂ بخشش دیکھ
بندوں کو گنہگار سمجھ کر بخشے

۲۱ رمضان ۱۳۳۹ھ

ولہ

ایمان کی رسم و راہ سچ کہنا ہے
ہر حال میں ہم کو آہ سچ کہنا ہے
سچوں کو بہت رنج دیا ہے سچ نے
دنیا میں بڑا گناہ سچ کہنا ہے

۲۹ رمضان ۱۳۳۹ھ

رُباعی

ناصح کے بتانے نہ جتانے سے ملا ۔۔۔ یہ گر تو ہم آپ زمانے سے ملا
اللہ کرے کہ آگئے دشمن کو ملے ۔۔۔ مجھ کو جو کسی کا دل کھانے سے ملا

۱۳ شوال سنہ ۱۳۳۴ھ

ولہ

یارب! دلِ بدگماں پر رحمت کر ۔۔۔ بدگو ہے بہت زباں پر رحمت کر
عیبوں کے سوا کسی کے دیکھا نہ سنا ۔۔۔ رحمت! مری آنکھ کان پر رحمت کر

۳۰ جمادی الاول سنہ ۱۳۳۶ھ

ولہ

بی۔ اے۔ ایم۔ اے تو خوشی سے پاس کیا ۔۔۔ ہر علم و ہنر کا ستیاناس کیا
کچھ فکر نجاتِ اُخروی کی اے دل ۔۔۔ کچھ دین کے اغراض کا احساس کیا

۲۹ شعبان سنہ ۱۳۳۶ھ

رُباعی

باطن کی لپیٹ کھول کر دیکھ لیا ہر شخص سے راست بول کر دیکھ لیا
ظاہر سے مطابقت نہ پائی ہم نے دل دل کو بہت ٹٹول کر دیکھ لیا

۱۳ر شوال ۱۳۳۶ھ

ولہ

لب پر نہ گلہ کوئی نہ گالی آئے اک بات نہ رنج دینے والی آئے
دے درگذر اسطرح کی یارب دل میں دشمن کا خیال آئے تو خالی آئے

۶ر صفر ۱۳۳۷ھ

ولہ

اصرار مناہی پہ نہ کر توبہ کر رکھ اپنی حقیقت پہ نظر توبہ کر
اللہ کو بندے کی ندامت ہے پسند سو بار گناہ کر مگر توبہ کر

۱۵ر رجب ۱۳۳۷ھ

رباعی

دیکھیں گے نہ یہ نگاہ عزت سے تجھے
پوچھیں گے نہ واجبی مروت سے تجھے
دولت والوں سے عہدہ داروں سے نہ مل
بہرہ نہیں گر دولت و خدمت سے تجھے

غرۂ رمضان ۱۳۳۴ھ

وله

دنیا میں کہ دین میں ہیں ممتاز نہیں
سرسبز نہیں ہیں ہم سرافراز نہیں
اعمال کی پا رہے ہیں چپ چاپ سزا
لاٹھی ہیں خدا کی سچ ہے آواز نہیں

۱۳ شوال ۱۳۳۴ھ

وله

لازم نہیں حد سے بھی نکل کر چلنا
چلتی ہوئی چال کو بدل کر چلنا
انسانیت کی ہیں یہ باتیں اے دل
جھک کر ملنا ذرا سنبھل کر چلنا

۱۳ شوال ۱۳۳۴ھ

رُباعی

اک ایک سے زردار وہاں کون نہ تھا
یوسف کا خریدار وہاں کون نہ تھا
تھا عشق کہ رسوا کیا بڑھیا ہی کو ہائے
ورنہ سربازار وہاں کون نہ تھا

۲۶ رمضان ۱۳۳۹ھ

(ولہ)

کرتا ہوں ترا شکر خدایا سو بار
اک بار یہ سر پر مرے تھا یا سو بار
ہلکا ہوا میں ایک کے سو سو دیکر
کم ظرف نے احسان جتایا سو بار

۲۶ رمضان ۱۳۳۹ھ

(ولہ)

دل تیرا برنگ فیل دے اور تجھے
رتبہ اس سے جلیل دے اور تجھے
اے چرخ غریبوں کو ستانے والے
ہے حق سے دعا کہ ڈھیل دے اور تجھے

۲۶ رمضان ۱۳۳۹ھ

رُباعی

رشّاک مزاجوں کے عجب رستے ہیں ملتے ہیں بہت صاف بہت ہنستے ہیں
معمور ہیں دل رشک و حسد سے اُن کے کیا سچ ہے کہ ہنستے ہوئے گھر بستے ہیں

۱۵ شوال ۱۳۳۹ھ

ولہ

وہ دل کہ بڑائی کا خیال اس میں ہے شیطان کی حقیقت کی مثال اس میں ہے
اک چیز ہے آدمی اور آپ اپنے کو ناچیز ہی جانے تو کمال اس میں ہے

۱۵ شوال ۱۳۳۹ھ

ولہ

ہر چند کہ ہے واقف اسرار لباس کرتا نہیں اک بات کا اظہار لباس
کتنے مرے عیب اہل مجلس سے چھپائے کیا چیز ہے المعی بھڑک دار لباس

۱۵ شوال ۱۳۳۹ھ

رُباعی

امت میں نبیؐ کے ایسے اکثر ہوں گے
رتبے میں فرشتوں سے جو بہتر ہوں گے
معراج کی تھی حد مسلمانوں کو
اب اہلِ زمین آسماں پر ہوں گے

۱۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۰ھ

ولہ

بدنام بُرا نہ نیک نام اچھا ہے
یاں دورسے خلقت کو سلام اچھا ہے
اچھا تجھے بولیں کہ نہ بولیں ایدل
تو دیکھ لیا کر کہ یہ کام اچھا ہے

۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ

ولہ

میموں کے کوئی داشناسوں میں ہیں
یورپ کی شرابیں کہیں کاسوں میں ہیں
اللہ ذلیل فطرتیں بھی کیا کیا
پوشیدہ یہ شائستہ لباسوں میں ہیں

۴ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۱ھ

رباعی

ذہن تجھے کیا سمجھے ہیں کیا کہتے ہیں
جو کہتے ہیں یکتا و بجا کہتے ہیں
مشرک تجھے بتلاتے ہیں جب ایک سے دو
اٹھتی ہیں جو انگلیاں تو لا کہتی ہیں

۲۷ رمضان ۱۳۲۱ھ

ولہ

اچھے اچھے مکاں بنا سکتا ہوں
دولت کا ہر اک ٹھاٹھ دکھا سکتا ہوں
پڑ جائے غریب علم والوں سے جو کام
میں اپنی جگہ ناک چڑھا سکتا ہوں

۷ رمضان ۱۳۲۲ھ

ولہ

مستی ہے یہ کس کس کے لگا منہ کو آنے
مانے نہ نبی کو نہ خدا کو جانے
ناداں ترا زور رہے گا باقی
جب تک کہ ہیں کچھ پیٹ میں چلنے دانے

۲ شوال ۱۳۲۲ھ

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

المی حیدرآبادی

مصنف

ناشر

اردو شاعری

سرور